مارچ۔اپریل ۱۹۹۲ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
مطالعہ قرآن حکیم (سورۃ آل عمران آیت ۱۸۵)	ڈاکٹر اسرار احمد	۳
رزق کا قرآنی تصور	حبیب اللہ قریشی مرحوم	۷
خصوصیاتِ صحابہ کرامؓ قرآن حکیم کی روشنی میں	سید اخلاق حسین قاسمی	۲۳
انسانی حقوق سیرت طیبہ کی روشنی میں	سید شبیر حسین زاہد	۳۴
حکمتِ اقبال (۴۰)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۴۷
لغات و اعراب قرآن (۳۳)	پروفیسر حافظ احمد یار	۶۱
تبصرۂ کتب	ادارہ	۸۶
ڈاکٹر طاہر سعید کے نام (۱۷)	ڈاکٹر حافظ محمد مقصود	۸۸
عکسِ اسرارِ خودی (منظوم)	ڈاکٹر عصمت جاوید	۹۳

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

الحمد للہ کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی سے عمومی استفادے اور عربی زبان کی تحصیل کے لئے

خط و کتابت کورس

کا اجراء گذشتہ سالوں کے دوران ہو چکا ہے۔

○ پہلا کورس "قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی" کے زیر عنوان ہے' جو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درس قرآن کے ۴۴ کیسٹ اور چند کتب پر مشتمل ہے۔

○ دوسرا کورس ابتدائی عربی گرامر کی تدریس سے متعلق ہے جس میں "آسان عربی گرامر" سبقاً سبقاً پڑھائی جاتی ہے۔ قرآن حکیم کا مفہوم براہ راست سمجھنے کے لئے عربی زبان کی تحصیل اشد ضروری ہے۔

سال ۱۹۹۲ء کے آغاز ہی سے خط و کتابت کورس میں داخلہ لیجئے اور گھر بیٹھے قرآن حکیم کی رہنمائی اور عربی زبان کی تدریس سے فائدہ اٹھایئے۔

نوٹ: ہر دو کورس کے پراسپکٹس' داخلہ فارم اور دیگر تفصیلات شعبہ خط و کتابت کورس' قرآن کالج' ۱۹۔ اے اتاترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور سے طلب فرمائیں۔

فون: ۸۳۳۶۳۸-۸۳۳۶۳۷

المعلن: مدیر شعبہ خط و کتابت کورس' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

قرآن اکیڈمی (لائبریری)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار ڈاکٹر محمد رفیع الدّین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

جاری کنندہ: چوہدری مظفر حسین

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۱ | مارچ/اپریل ۱۹۹۲ء - رمضان المبارک/شوال المکرم ۱۴۱۲ھ | شمارہ ۳/۴

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶- کے- ماڈل ٹاؤن- لاہور ۱۴- فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بیکری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون -/۴۰ روپے، فی شمارہ -/۴ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

شارحِ فکرِ اقبال ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کے بارے میں یہ بات ان کے حلقۂ احباب میں شامل تمام افراد جانتے ہیں کہ 'حکمتِ قرآن' کے ساتھ مرحوم کی وابستگی اوّل روز سے تھی' بلکہ یہ وابستگی اتنی گہری اور شدید تھی کہ 'حکمتِ قرآن' کے نام کے ساتھ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا نام قریباً لازم و ملزوم سمجھا جاتا ہے۔ مرحوم کی وفات کے بعد جناب چوہدری مظفر حسین صاحب نے' جو ڈاکٹر صاحب مرحوم کے دستِ راست تھے اور مرحوم کی حیات میں بھی 'حکمتِ قرآن' کے شعبۂ ادارت میں شامل تھے' پرچے کی مکمل ذمہ داری کو سنبھالا۔ تاہم بعد ازاں یہ پرچہ قدرے تعطل اور بے قاعدگی کا شکار ہوگیا اور بالآخر ۱۹۸۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن کے صدرِ مؤسّس محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس کی ادارت سنبھالی۔ تاہم 'حکمتِ قرآن' کے صفحۂ اوّل پر "جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم" کے الفاظ آج تک باہتمام شائع کئے جاتے ہیں۔

حال ہی میں محترم چوہدری مظفر حسین صاحب کے ذریعے یہ بات ہمارے علم میں آئی ہے کہ اگرچہ "حکمتِ قرآن" کے روحِ رواں ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم ہی تھے لیکن اس کے جاری کنندہ وہ نہیں' چوہدری مظفر صاحب تھے۔ ہم چوہدری صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اس واقعاتی غلطی کی جانب ہماری توجہ مبذول کرائی۔ چنانچہ زیرِ نظر شمارے سے ہم صفحۂ اول کے مندرجات میں ترمیم کر رہے ہیں۔ آئندہ جاری کنندہ کے طور پر چوہدری مظفر حسین صاحب کا نام درج ہوگا' تاہم حکمتِ قرآن کے ساتھ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے معنوی تعلق کے اظہار کے لئے "بیادگار ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم" کے الفاظ اہتمام کے ساتھ شائع کئے جاتے رہیں گے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کے ایک اور قریبی ساتھی حبیب اللہ قریشی مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ مضمون جو ہمیں محترم چوہدری مظفر صاحب نے ارسال کیا ہے' چوہدری صاحب ہی کے تعارفی نوٹ کے ساتھ زیرِ نظر شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے ——

(باقی صفحہ ۹۲ پر)

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۂ آلِ عمران

آیت ۱۸۵

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝

"ہر جاندار کو موت کا مزہ لازماً چکھنا ہے اور قیامت کے دن تمہیں پورا پورا اجر دے دیا جائے گا۔ پس جو آگ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا اس نے بھرپور کامیابی حاصل کر لی۔ اور یہ دُنیوی زندگی تو سوائے دھوکے کے سامان کے اور کچھ ہے ہی نہیں!"

سورۂ آل عمران اور سورۃ البقرہ دونوں کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشترک نام "الزہراوین" سے موسوم فرمایا ہے، یعنی دو انتہائی روشن اور تابناک سورتیں۔ ان دونوں کے مابین بہت سی دوسری مشابہتوں کے ساتھ یہ امر بھی مشترک ہے کہ دونوں تقریباً مساوی نصفین میں منقسم ہیں۔ دونوں کے نصفِ اوّل میں رُوئے سخن اصلاً اہلِ کتاب کی جانب ہے اور نصفِ ثانی میں خطاب مسلمانوں سے ہے، بحیثیتِ اُمّتِ مسلمہ ——— اس فرق کے ساتھ کہ سورۃ البقرہ میں اہلِ کتاب میں سے تمام گفتگو یہود کے ساتھ ہوئی ہے اور سورۂ آلِ عمران میں اکثر و بیشتر نصاریٰ کے ساتھ۔ سورۂ آلِ عمران میں مسلمانوں سے خطاب یوں تو آیت نمبر ۱۰۰ ہی سے شروع ہو جاتا ہے اور سورت کے اختتام تک چلتا ہے لیکن اس میں درمیانی آیات یعنی از آیت نمبر ۱۲۱ تا آیت نمبر ۱۸۰ تو ایک نہایت ہی مربوط اور مسلسل خطبے کی صورت میں ہیں جس میں غزوۂ اُحد کے حالات و واقعات پر نہایت بھرپور تبصرہ بھی ہے اور اُس کے معاً بعد

مترتب ہونے والے اثرات کے ضمن میں مفصّل ہدایات بھی۔ اس کے بعد چار آیات میں ایک مختصر حوالہ ہے یہود کے علماء و عوام اور ان کے زیر اثر منافقین کی شرارتوں کا ـــــ اور اس کے بعد آتی ہے زیر درس آیت جس کے الفاظ اتنے جامع ہیں کہ اُن میں روئے سخن دونوں جانب قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک[1] طرف مومنین صادقین کے لیے ان الفاظِ مبارکہ میں بشارت ہے تو دوسری[2] جانب یہود اور منافقین کے حق میں انہی میں تہدید و انذار بھی موجود ہے، اور سلسلۂ کلام سے علیٰحدہ کر کے اگر نگاہ کو صرف اس آیۂ مبارکہ ہی پر مرتکز کر دیا جائے تو یہ خود اپنی جگہ ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی توحید، معاد اور رسالت میں سے انسان کے افعال و اعمال اور اخلاق و کردار پر مؤثر ہونے کے اعتبار سے اہم ترین ایمان، یعنی ایمان بالآخرۃ کے بیان میں معجز نما فصاحت و بلاغت کی حامل ہے۔

اس آیۂ مبارکہ کا آغاز ہوتا ہے ایک ایسی اٹل حقیقت یعنی UNIVERSAL TRUTH کے ذکر سے جس کی تردید کا کوئی امکان ہی نہیں، یعنی موت جو زندگی کی عظیم ترین حقیقت ہے اور جس سے کسی ذی حیات کو رستگاری نہیں، سوائے اُس ذاتِ "حیّ و قیوم" کے جو خود موت اور زندگی دونوں کا خالق ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی: "خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا" اس سے ایک تو رہنمائی ملتی ہے اُس حکمت کی جانب کہ گفتگو کا آغاز کسی ایسی بات سے کرنا چاہیے جو متفق علیہ ہو اور جس سے انکار کی تاب و مجال مخاطب کو نہ ہو، خواہ وہ ایک بالکل پیش پا افتادہ حقیقت ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ جو چیزیں انسان کی آنکھوں کے سامنے ہمیشہ رہتی ہیں اکثر و بیشتر ان ہی سے غفلت ہو جاتی ہے۔

دوسرا معاملہ الفاظ اور اسلوبِ بیان کا ہے، اور ظاہر ہے کہ "کلامُ الملوک مُلوک الکلام" کے مصداق شہنشاہِ ارض و سماوات سے بہتر کلام کس کا ہو سکتا ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ کُل چار الفاظ ہیں: "كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ" اور ان میں سے ہر ایک خود اپنی جگہ بھی نہایت حسین و جمیل تراشیدہ ہیرے کے مانند ہے۔ اور پھر بندش اور ترکیب کا کمال مستزاد ہے جس نے حُسنِ کلام کو دوبالا کر دیا ہے ـــــ اور پھر سونے پر سہاگہ ہیں صوتی اثرات! ذرا غور سے کام لیا جائے تو معاملہ تو صرف انسانوں کا زیر بحث ہے لیکن الفاظ "كُلُّ نَفْسٍ" کے لائے گئے ہیں۔ ذرا تقابل کیجئے کہ اگر یہاں الفاظ "كُلُّ اِنْسَانٍ" ہوتے تو بات اپنی جگہ پوری ہوتے ہوئے بھی کتنی پھیکی اور بے جان سی ہو جاتی ـــــ "كُلُّ نَفْسٍ" نے ایک

اٹل اور ازلی و ابدی حقیقت کو ہمہ گیر وسعت بھی عطا کر دی ہے۔ پھر "ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ" پر غور کیجیے، اس میں ایک تو 'چکھنا' ہی فصاحت و بلاغت کی معراج ہے' اس لیے کہ 'مرنے' اور 'موت کا مزا چکھنے' میں نتیجے کے اعتبار سے خواہ کوئی فرق نہ ہو' سامع یا قاری پر اثرات کے مترتب ہونے کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پھر یہ 'چکھنا' یہاں "ذَاقَ يَذُوْقُ" سے فعل کی صورت میں نہیں آیا بلکہ اسم فاعل کی صورت میں آیا ہے جس میں تاکید اور زورِ کلام اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمے میں لازماً کا اضافہ کیا گیا۔ یعنی: "ہر جاندار کو موت کا مزہ لازماً چکھنا ہے!" ـــــ واضح رہے کہ جملہ اسمیہ میں جو تاکید اور توثیق ہوتی ہے وہ جملہ فعلیہ میں نہیں ہوتی ـــــ!!

آگے فرمایا کہ تم سب کو اپنے کیے کا پورا پورا بدلہ قیامت کے روز مل جائے گا۔ قربان جائیے اس بلاعت کے کہ اس میں ایک جانب کفار و منکرین' خواہ وہ مشرکین میں سے ہوں خواہ اہلِ کتاب میں سے' پھر خواہ یہودیوں سے ہوں خواہ مارِ آستین منافقین میں سے' ان سب کے لیے شدید تہدید و وعید ہے ـــــ اور دوسری جانب مومنینِ صادقین کے لیے تسلی بھی ہے اور دلجوئی بھی' گویا بشارت کا پورا سامان موجود ہے' اس لیے کہ ان کے حق میں "یوم القیامہ" رحمتِ خداوندی کے ظہور کا دن ہے' بفحوائے الفاظِ قرآنی : كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ (اُس نے اپنے اُوپر رحمت کو واجب کر لیا ہے۔ وہ لازماً جمع کرے گا تمہیں قیامت کے دن، اس میں ہرگز کوئی شک نہیں!) اہلِ ایمان تو درحقیقت اُسی دن کے اُمیدوار ہیں' اور ان کے سارے حوصلے اور ولولے اور تمام آرزوئیں اور اُمنگیں اُسی دن سے وابستہ ہیں' اس لیے کہ وہ ان کی اپنے رَبّ سے ملاقات کا دن بھی ہے اور اپنے خالق و مالک اور محبوبِ حقیقی کے دیدار کا بھی۔ ان کے لیے اس دن کے ذکر میں دھمکی کا اثر نہیں بلکہ تسلّی و دلجوئی یعنی REASSURANCE کی کیفیت ہے۔

اس آیۂ مبارکہ میں اَجْر کی جمع اُجُوْر اور صیغۂ مضارع مجہول یعنی تُوَفَّوْنَ کے الفاظ بہت قابلِ توجہ ہیں' اس لیے کہ 'اجر' کہتے ہیں کسی عمل کے بدلے کو' جیسے مزدوری کی اُجرت یا کسی نیکی یا بدی کا ثواب یا عذاب' اور یہ لازماً حساب کتاب کی چیزیں ہیں جن میں عمل کی مقدار کی مناسبت ہی سے اُجرت ملتی ہے' بخلاف 'فضل' کے کہ اُس میں کسی حساب کتاب یا ناپ تول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے ضمن میں تو کہیں 'بغیر حساب' کے الفاظ ملیں گے اور کہیں "مَا يَشَآءُ" کے۔

جبکہ یہاں اُجرت کی مناسبت سے لفظ آیا ہے "تُوَفَّوْنَ" کا۔ اس لیے کہ "وَفّٰی یُوَفِّیْ" کے معنی ہیں کسی کو کوئی چیز پوری پوری دے دینا اور اس میں کسی پہلو سے کوئی کمی نہ کرنا جس کی تاکید مزید کے لیے الفاظ آئے سورۂ ہود کی آیت ۱۰۹ میں: "وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ" یعنی "ہم اُن کو اُن کے اعمال کا بدلہ دیں گے پُورا پُورا بغیر کسی کمی کے"۔ یہاں یہ عرض کرنے کی حاجت نہیں ہے کہ یہ الفاظ جب جرم و گناہ کی سزا کے ضمن میں آئیں تو کس درجہ لرزا دینے والے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنْ سَخَطِكَ وَعَذَابِكَ۔ (اے رَبّ! ہم تیری ناراضی اور سزا سے تیرے ہی عفو و درگذر اور جُود و کرم کی پناہ میں آتے ہیں!)

آخر میں فرمایا: جو آگ سے بچا لیا گیا اور جنّت میں داخل کر دیا گیا اُس نے عظیم کامیابی حاصل کر لی! اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ (اے اللہ! ہمیں بھی اُن ہی میں شامل فرما دے!) آیت کا آخری ٹکڑا اہم ترین ہے اور یہ دراصل خلاصہ ہے ایمان بالآخرت کا، کہ اگر انسان کی آنکھیں اسی حیاتِ دُنیوی کی زینتوں اور رونقوں اور زیبائشوں اور آرائشوں میں اُلجھ کر رہ جائیں اور آخرت سے نسیان و ذہول لاحق ہو جائے تو پھر یہ ایک دھوکے کی ٹٹّی اور بصیرتِ انسانی کے لیے پردہ اور حجاب بن جاتی ہے اور اُس کا سارا ساز و سامان متاعِ غرور یعنی دھوکے کا سودا بن کر رہ جاتا ہے۔ حالانکہ اگر انسان آخرت کو پیشِ نظر رکھے اور اسی کو اپنا مطلوب و مقصود بنا لے تو پھر یہی حیاتِ دُنیوی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ مبارک "اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ" (یعنی دُنیا آخرت کی کھیتی ہے) کے مصداق ایک حقیقتِ کبریٰ کا رُوپ دھار لیتی ہے اور انسان یہاں یہ سمجھ کر محنت کرتا ہے کہ یہاں بوؤں گا تو وہاں کاٹ سکوں گا، اور اس طرح رہبانیت اور ترکِ دُنیا کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

بقیہ: انسانی حقوق

رسولوں میں فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض انبیاء کو مانتے ہیں بعض کو نہیں ..... پس یہ لوگ پکّے کافر ہیں۔ اور ہم نے ایسے کافروں کے واسطے ذلّت کا عذاب تیار کر رکھا ہے"۔ (النساء: ۱۵۰ - ۱۵۱)

(ع) اقتدا کا حق: "یہ (حضراتِ انبیاء") ایسے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی تھی، سو آپ بھی انہی کے طریق پر چلئے"۔ (الانعام: ۹۰) "بیشک رسولؐ کی زندگی میں تمہارے لئے عمدہ نمونہ ہے"۔ (الاحزاب: ۲۱)

(جاری ہے)

رزق کا قرآنی تصوّر

تحریر: حبیب اللہ قریشی مرحوم

صاحبِ مضمون کا مختصر تعارف

چوہدری مظفر حسین صاحب (جاری کنندۂ حکمت قرآن) کے قلم سے

جناب حبیب اللہ قریشی مرحوم و مغفور ہمارے ادارے کے بانی اراکین میں سے تھے اور ۱۹۶۶ء سے لے کر تاحینِ حیات (۱۹۸۵ء) آپ آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کے فنانشل ڈائریکٹر رہے۔ وہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کے مخلص ترین دوستوں میں سے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان سے بے حد محبت فرماتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ کئی بار ڈاکٹر صاحب کے ہاں شب گزاری کا اتفاق ہوا اور ہمیشہ یوں محسوس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم پوری پوری رات ذکر و فکر اور گریہ نیم شبی میں گزار دیتے ہیں۔

حبیب اللہ قریشی مرحوم گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے۔ مرحوم نے ان پرانے وقتوں میں ہیلی کالج لاہور سے بی۔ کام کیا جب بی۔ کام کی ڈگری نام کا حصّہ بن جایا کرتی تھی۔ محکمہ ریلوے میں ملازم ہوئے اور وہیں سے بطور اکاؤنٹس آفیسر اسسٹنٹ فنانشل ایڈوائزر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ لمبے تڑنگے، دبلے پتلے، چہرہ لمبا اور گوشت کم، آنکھیں بڑی بڑی، کافی بڑا سر۔ یہ ہے ان کا مختصر سا حلیہ۔ سادہ لباس، سادہ مزاج لیکن بے حد وسیع مطالعہ۔ جدید ترین سائنسی معلومات سے باخبر اور کمپیوٹر کے بارے میں اتنی معلومات رکھتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب کمپیوٹر کا نام پاکستان میں اجنبی تھا۔

قرآن حکیم سے انہیں عشق تھا۔ سفر میں ہوں یا حضر میں، قرآن حکیم کا نسخہ اور ایک عدد جائے نماز ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے۔ اور جو فرصت بھی میسر آتی اس میں قرآن حکیم سے ہم کلام رہتے۔ ملازمت کے سلسلہ میں گوجرانوالہ تا لاہور بذریعہ ریل سفر کرتے اور دورانِ سفر مطالعۂ قرآن ہی میں مستغرق رہتے۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم سے ان کی ملاقات اسی سفر میں ہوئی۔ جن دنوں (۱۹۴۸-۵۳ء) ڈاکٹر صاحب لاہور میں ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک ری کنسٹرکشن اور بعد میں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ میں ریسرچ آفیسر تھے وہ بھی گوجرانوالہ میں ہی رہتے تھے اور لاہور آنے جانے کے لئے وہ بھی ریل کا سفر ہی اختیار کرتے۔

جب ۱۹۷۳ء میں حکمتِ قرآن کا اجراء ہوا تو میں نے قریشی صاحب سے اصرار کیا کہ وہ بھی حکمتِ قرآن کے لئے کچھ لکھیں۔ انہوں نے میرے بار بار کے اصرار پر ایک مضمون "رزق" کے عنوان سے لکھ کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ شاید یہ آپ کے معیار پر پورا نہ اترے۔ میں مجلسِ ادارت میں صرف منتظم کی حیثیت سے شامل تھا اور مضمون کو قبول کرنا یا رد کرنا میرے اختیار میں بھی نہیں تھا۔ لیکن حادثہ یہ ہوا کہ یہ مضمون کاغذات میں کہیں ادھر ادھر ہو گیا اور مجھ سے کھو گیا۔ تلاش بسیار کے باوجود ان کی زندگی میں یہ مضمون نہ مل سکا قریشی صاحب مرحوم کو یہ بد گمانی ہی رہی کہ شاید مضمون کو غیر معیاری سمجھ کر رد کر دیا گیا ہے اس لئے شائع نہیں ہو سکا۔ اگرچہ انہوں نے کبھی اس کے بارے میں یاد دلایا نہ ہی کوئی شکایت کی۔

قریشی صاحب ۱۹۸۵ء میں رحلت فرما گئے اور دو ماہ قبل یہ مضمون میرے پرانے کاغذات میں سے اچانک مل گیا۔ پہلے تو میں نے اسے ان کی یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھ چھوڑا لیکن بعد میں خیال آیا کہ حکمت قرآن تو بفضلہٖ اب بھی جاری ہے، کیوں نہ اس ادارہ کے مدیران کو بھیج دوں۔ اگر آپ مضمون کی مناسب اصلاح کر کے حکمتِ قرآن میں شائع کر سکیں تو مجھے مسرت ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اجسام کے معیناتِ حیاتی وارتقائی کو رزق کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ ایک وسیع مفہوم لئے ہوئے استعمال کیا گیا ہے۔ محض اشیاءِ خورد و نوش ہی رزق نہیں، جو "مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّ مَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ" (الذّٰریٰت۔۵۷) سے ظاہر ہے۔

فضائے سماوی سے زمین پر اترنے والے اسبابِ زیست یعنی بارانِ رحمت، سورج کی حیات پرور روشنی اور حدت، ٹوٹ کر جلنے والے ستاروں کی راکھ جو زمین کی زرخیزی میں اضافہ کر رہی ہے حسبِ ارشاد ربانی "وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" (الجاثیہ۔۵) رزق کی مثالیں ہیں۔ حیات بعد الموت کے لئے جنت کی نعمتوں کو بھی رزق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی "لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ○ فَوَاكِهُ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ○ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ○ (الصّافات۔۴۱ تا ۴۳) اور "يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ" (المؤمنون۔۴۰) اور شہداء کے لئے "بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ" (آل عمران۔۱۶۹) فرمایا۔ روح کی غذا بھی، رزق ہے، جیسے "مکذبین" کے متعلق فرمایا: "وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ" (الواقعہ۔۸۲)

اس شعوری نظامِ کائنات میں کچھ قوتیں جاری و ساری ہیں جو اس کی ہیئتِ ترکیبی اور فعالی کی ضامن ہیں۔ ذرہ کی برقی اساس اپنے ترکیبی ہیولیٰ کے دائروں کے استقلال کے لئے ایک توازنِ مسلسل کی محتاج ہے۔ اور یہی توازن اجرامِ فلکی کی گردش کے دوروں کا ضامن ہے۔ "وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ" (الرحمٰن۔۷) میں اسی برقی توازن کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ یعنی اس نے آسمان کو بلند کیا اور (اس میں) توازن (کا قانون) قائم کیا۔ زمین و آسمان کی تخلیق کی کیفیت اس طرح بیان ہوئی ہے:

خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ .....وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَا اَقْوَاتَهَا فِيْ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ○ ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَا اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ○ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ

اَمْرَھَا(حٰمٓ السجدہ:۹-۱۱)

"زمین کو دو زمانوں میں پیدا کیا'......... اس کے اوپر پہاڑ رکھے' اس میں برکت دی اور اس میں اس کی غذائیں مقدر کیں چار زمانوں میں۔ پوچھنے والوں کے لئے اتنا کافی ہے۔ پھر وہ فضائے سماوی کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں سی تھی' تو اس کو اور زمین کو فرمایا کہ خوشی سے یا مجبوری سے تمہیں (ایک کائناتی نظام کا حصہ) بننا ہو گا۔ انہوں نے عرض کیا ہم اپنا فرض بخوشی انجام دیں گے۔ تو ان کو سات آسمانوں میں تشکیل دیا دو زمانوں میں اور ہر آسمان کا قانون اس کی سرشت میں رکھ دیا"

ان آیات میں زمین کے لئے "اَقْوَاتَھَا" اور آسمانوں کے لئے "اَمْرَھَا" رزق ہی ہے جس کے طفیل شعور کی نگاہ میں ایک عالمِ رنگ و بو اور ایک جہانِ توازن و استقلال برپا ہے اور اسبابِ رزق کے حصول کے لئے ہی زندگی کو ایک ذوقِ تگ و پو عطا کیا گیا ہے' جن کے ذریعہ سے "فَالِقُ الْحَبِّ وَ النَّوٰی" "یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ" کے مصداق جامد اشیاء سے زندگی کا ظہور کرتا ہے اور جب زندگی جبلّت کی خود کار پابندیوں سے آزاد ہو جاتی ہے اور اپنے راستے خود تلاش کرنے لگتی ہے تو رزق رسانی ایک طرح سے تلاشِ رزق پر موقوف تر ہو جاتی ہے اور اس کے انداز بھی پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں۔ تاہم بنیادی طور پر رزق کی ضرورت وہی رہتی ہے' یعنی اجسام اپنے قیام و نمو کے لئے ہر سطح پر اس کے محتاج ہیں۔ رزق کی بقا کے لئے رزّاق مختلف طریقوں سے خونِ زندگی مہیا کرتا رہتا ہے' رُوح اور جسم کے متوازن عمل کے لئے غذا بہم پہنچاتا ہے اور موسم اور کائناتی مہالک سے پناہ دیتا ہے۔ گویا زندگی کو ایک آغوشِ مہد عطا کرتا ہے۔

رزّاق

رزّاق وہی ہے جو زندگی کا خالق ہے۔ جہاں نظامِ حیات کو ایک پیدا کرنے والے کی ضرورت ہے' وہیں اس خالق کے لئے "اَلرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنُ" (الذاریات-۵۸) ہونا بھی لازم ہے' کیونکہ تخلیقِ مسلسل کی احتیاجات مخلوق کو ضامنِ ربوبیت سے محروم کر کے اتفاقات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کی متحمل نہیں اور پھر

مسئولیت کے لئے تو کچھ بنیادی عطائیں بھی ضروری ہیں۔ ایک خلیہ یا جرثومہ کی بقا تو بڑی بات ہے' وہ پائیدار تخلیق بھی جو دفاع کے قدرتی حربوں سے لیس ہو کر عالمِ وجود میں آتی ہیں' ابتدائے حیات میں ایک مربوط نظامِ رزّاقی کے بغیر ماحول کے دستبرد سے مامون و مصئون نہیں رہ سکتیں۔ چنانچہ بادوباراں کے طوفانوں میں' کائناتی شعاعوں میں' تمازتِ آفتاب اور سرما کی برفیلی ہواؤں میں' اپنے اور غیر جنس کے دندانِ آز میں' زندگی کو محو کر دینے کی جو بے رحم قوت موجود ہے اس سے محفوظ کرنے کا رفیق و شفیق طریقۂ رزّاقی اور سایۂ عاطفت فراہم کر دیا گیا ہے۔

زندگی کی نچلی سطحوں پر بقائے نوع کے لئے جبلّی ساختیں ایک حد تک مدّ ہوتی ہیں' مگر خود شعورِ انسانی کی سطح پر نظامِ معیشت اتنا سادہ نہیں رہتا اور آج کا انسان تو اپنے آپ کو ایک بے قید و نظم معاشی ماحول میں گرفتار پاتا ہے' جہاں کوئی ڈارون کا متبع "تنازُع للبقاء" اور "بقائے اصلح" کے فلسفوں میں الجھ کر انسان اور حیوان کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا نظر آتا ہے تو کوئی وجدان سے محروم سارتری اپنی تہی دستی اور کوتاہ بینی سے اس محبت بھری کائنات میں بستے ہوئے تنہا خلاؤں میں موہوم زندگی بسر کر رہا ہے۔ ان پریشان خیالوں کی وجہ یہ ہے کہ انسان نے مادی ترقی کر کے رزق کے اعلیٰ پیداواری طریقے تو ایجاد کر لئے ہیں مگر اسی مناسبت سے اخلاقی و روحانی مدارج طے نہیں کئے' جن کی بنا پر اس پیداوار کو رزاق کے قانون کے مطابق تقسیم کیا جائے اور صرف میں لایا جائے۔

رزق پانے والا انسان

دانشوروں' ماہرینِ اقتصادیات اور سیاسی زُعماء کی چیرہ دستیوں کے باوجود' بلکہ انہی کے توسط سے' رزّاقِ حقیقی ابھی تک مخلوق کو رزق دیئے جا رہا ہے' مگر انسانی فساد کی چھاپ اس داد و دہش پر نمایاں ہے۔ سرمایہ پرستوں کی جمہوریت ہو' شہنشاہی ہو یا جُملاء کی آمریت' سب اقتدار پسندوں کی مسخ شدہ فطرت کے چلن ہیں۔ اور ع" بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی " شہروں کی غلیظ بدروؤں میں بسنے والے جرائم پیشہ نوجوان دُخان آلود مسموم ہواؤں میں سانس لیتے ہوئے اور مشقت پر مجبور "آزاد" مزدور' زمیندار' یا پارٹی کی ہوس ناکیوں سے زمین بوس ہوتے ہوئے مزارعین' زندگی کی ہر سہولت سے

محروم اور پامال نسلیں، جن کی حیات زمین کا ناسور ہے اور جن کی تولید و تناسل ایک بے نام روگ یا انسانیت کے اجتماعی ظلم کے بھیانک مظاہرے ہیں۔ اور یہ وہی انسان ہے جس کے متعلق ارشاد خداوندی ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (بنی اسرائیل ۔ ۷۰) کہ "ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں عطا فرمائیں، پاکیزہ اشیاء سے رزق عنایت کیا اور اپنی مخلوق کے ایک بڑے حصے پر ایک گونہ فضیلت دی"۔ عطاءِ رزق کا تو یہ عالم کہ: "..... آسمانوں سے مینہ برسا کر پھلوں سے تمہارے لئے رزق نکالا، سمندروں میں سفر کرنے کے لئے جہاز چلنے کے اصول بنائے، دریا تمہارے لئے مسخر کر دیئے، سورج چاند تمہارے خادم بنا دیئے اور رات اور دن تمہارے لئے کام پر لگا دیئے، غرض کہ جو کچھ تم نے مانگا ہم نے دے دیا"۔ (ترجمہ آیات ۳۲ تا ۳۴، سورۂ ابراہیم) اور اپنے دوست دشمن، عرب و عجم، گورے کالے کو بلا تمیز اپنی عطاؤں سے نوازا: "كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا" (بنی اسرائیل ۔ ۲۰) اور انسان کی بے لگامی پر ذرا سی قید لگائی: "وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَ لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَ لَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ" (القصص ۔ ۷۷) یعنی "اللہ کی دی ہوئی متاع سے آخرت کا سامان بھی کر اور اپنی دنیا کا حصہ لینا بھی نہ بھول اور جیسا اللہ نے تم پر احسان کیا ہے تو بھی اس کے بندوں سے نیکی کر اور زمین پر فساد کی راہیں تلاش نہ کر کہ وہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔ لیکن انسان نے سرکشی کی اور ایسا فساد برپا کیا کہ بحر و بر کانپ اٹھے: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ" (الروم ۔ ۴۱)

پیداوار اور اس کی تقسیم

علم الاقتصاد کی زبان میں وہ عناصر جن پر پیداوار کا انحصار ہے کہنے کو تو چار ہیں، یعنی (i) فطرت، عوامل (Land) (ii) محنت (Labour) (iii) اپنی انتظامی قابلیت

(Entrepreneur) اور (iv) سرمایہ (Capital) لیکن اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو دو ہی فریق رہ جاتے ہیں، یعنی فطرت کی عطا اور انسان کی محنت۔ کیونکہ محنت اور انتظامی قابلیت انسان ہی فراہم کرتا ہے اور سرمایہ ماضی کی پیداوار کا مَلحقی ہے جس کے پیدا کرنے میں دو ہی عناصر کار فرما تھے، یعنی قدرت کی عطائیں اور انسان کی کاوشیں۔

اب اسبابِ معیشت کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو کہ فطرت نے از خود کیا کچھ مہیا کر رکھا ہے:

۱۔ زمین کی سطح جو رہائش کے لئے ضروری ہے اور انسان کو اپنے گھر اور پیداواری عمل کے لئے کارخانے وغیرہ بنانے کی جگہ فراہم کرتی ہے۔

۲۔ قدرت کے مدفون ذخائر یعنی پانی، لوہا، کوئلہ، چونا، مختلف دھاتیں، تیل، گیس اور مختلف قیمتی پتھر وغیرہ وغیرہ۔

۳۔ دریا اور آبشاریں جو قوت کے سرچشمے ہیں۔ جنگلات، قدرتی پھول، پھل، حیوانات اور سمندر کی مچھلیاں وغیرہ۔

۴۔ آفتاب کی گرمی، روشنی، ہوائیں۔

اب جو مالک اپنے خادموں کو اتنی ساری چیزیں مفت مہیا کرتا ہے اور وہ خادم اس خام مال سے اپنے لئے سامانِ معیشت پیدا کرتے ہیں تو جب وہی مالک مطالبہ کرے کہ اس پیداوار میں خود اس کا بھی ایک حصہ مقرر رکھو تو کسی خود ساختہ معیارِ عقل کی رُو سے بھی یہ مطالبہ ناجائز نہیں ہو گا، رہا یہ سوال کہ وہ مالکِ حقیقی تو خود غنی ہے اور سب اس کے محتاج ہیں وہ اپنا حصہ کیوں مقرر کرنے لگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس کی رزّاقی کا طریقہ ہے کہ اپنے نام پر بندوں کے لئے مانگتا ہے کہ پیداوار کی تقسیم میں ایسے لوگوں کو بھی حصہ ملے جو اتفاقات یا اپنے ہم جنسوں کی سازش کے نتیجہ میں محتاج ہو کر زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں، مگر دولت والے یوں بھی کہنے لگتے ہیں: "اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰہُ اَطْعَمَہٗ" (یٰسٓ ۔ ۴۷) "کیا ہم ان لوگوں کو کھلائیں پلائیں جن کو اگر اللہ چاہتا تو خود روزی دیتا"۔

کسی اجتماعی نظام کو سمجھنے کے لئے اپنے جسم کے نظام پر نظر کر لینا کافی ہے۔ خونِ حیات کی ضرورت سارے اعضاءِ جسمانی کو ہے، ہاتھ پاؤں اور دماغی صلاحیتوں کے بل پر

روزی کمائی جاتی ہے' منہ سے کھانا کھایا جاتا ہے اور معدہ' انتڑیاں' جگر' پھیپھڑے اور دل ا۔ اپنے فرائض ادا کر کے اس خوراک سے سارے اعضاء کو حسبِ ضرورت خون فراہم کرتے ہیں۔ اب اگر ہاتھ پاؤں کمانے سے انکار کر دیں یا منہ اور معدہ ہضم کی مشقت سے کترا جائیں اور کہنے لگیں کہ جس عضو کو ضرورت ہو خود اپنی غذا بلا واسطہ حاصل کرے تو ظاہر ہے کہ تمام جسم بیمار ہو کر موت کے منہ میں جا گرے گا۔ انسانیت کی تمام سیاسی اور معاشی الجھنوں کی تہ میں یہی کیفیت نظر آئے گی۔ ایک طبقہ دوسرے کے لئے اس امید پر کام کرتا ہے کہ پیداوار میں اس کو مناسب حصہ ملے' لیکن اس میں مایوسی ہوتی ہے تو اِدھر ہڑتالیں اور اُدھر تالہ بندیاں شروع ہو جاتی ہیں اور نتیجۃً انقلابات برپا ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بین الاقوامی جنگوں اور طبقاتی کشمکش نے جہاں غریبوں کو افلاس کی چکی میں پیسا ہے وہاں صاحبِ اقتدار طبقوں کی بھی راتوں کی نیندیں حرام کی ہیں۔ چنانچہ امتِ مسلمہ کو ایک جسدِ واحد بننے کا حکم دیا گیا ہے کہ جب اس کا کوئی عضو تکلیف میں ہوتا ہے تو سارا جسم رات کو جاگتا ہے اور تپ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ رحمۃٌ لِلعالمین ؐ نے فرمایا کہ تم کو فطرت کی جانب سے مدد دی جاتی ہے اور رزق تو صرف ضعیفوں کی وجہ سے ہے اور تم تو محض تقسیم کے آلہ کار ہو------ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ "وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا" (ھود:۶) اور یہ کہ "نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَھُمْ مَعِیْشَتَھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا" (الزخرف۔۳۲) یعنی خود ہم ہی نے ان کے درمیان اسبابِ معیشت کی تقسیم فرمائی۔

اور یوں بالواسطہ مادی اسبابِ معیشت کی تقسیم سے روحانی اصلاح کا مقصدِ حقیقی بھی پورا ہوتا ہے: وَ مَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الحشر۔۹' التغابن۔۱۶) یعنی جو نفس کے بخل سے بچ گیا وہ نجات کا مستحق ہوا۔ اور ایک دوسرے کی تکلیف میں مدد کرنے سے جذبۂ ایثار پیدا ہوتا ہے جو معاشرہ کے امن و سکون کے لئے ضروری ہے: "یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَ لَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ" "وہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود تنگی سے گذاران کریں"۔ کیونکہ بلاواسطہ رزق سب کے لئے اگر یکساں فراہم کر دیا جاتا تو جنگل کے درندوں کا سماں پیدا ہو جاتا: "وَلَوْ بَسَطَ اللّٰہُ الرِّزْقَ لِعِبَادِہٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ" (الشوریٰ۔۲۷) ------ کمزور

بالکل طاقتور کے رحم و کرم پر ہوتے جیسے جنگل میں درندے اور حیوان۔ پھر مار دھاڑ کے علاوہ انسان کا مشغلہ ہی کیا رہ جاتا۔ اس طریقہ سے فساد فی الارض کے امکانات کم ہو گئے ہیں اور انسان اخروی زندگی کی نعمتوں کا مستحق قرار پایا ہے: تِلْکَ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ نَجْعَلُھَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا (القصص۔۸۳) "ہم نے یہ آخرت کا گھر ان لوگوں کے لئے تیار کیا ہے جو زمین میں تکبر اور فساد نہیں چاہتے"۔

انفاق فی سبیل اللہ کو جو زکوۃ سے تعبیر کیا گیا ہے تو اس لفظ کا لغوی معنی نشوونما یا بالیدگی ہے (آج کل کے محاورہ میں ارتقاء)۔ گویا جہاں خرچ کرنے سے مال بڑھتا ہے (اور اس کا ثبوتِ ظاہری معاشیات کا Multiplier Effect ہے) وہیں خرچ کرنے والے کا روحانی ارتقاء بھی ہوتا ہے' بلکہ بمصداق "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" (آل عمران۔۹۲) کوئی خوبی تم میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی جب تک اپنے محبوب مال سے خرچ نہ کرو۔

اور خرچ کرو تو لینے والے سے نہ بدلہ چاہو' نہ شکر گذاری کے متمنی ہو' اس لئے فرمایا: وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا ○ اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْہِ اللّٰہِ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا ○ (الدہر۔۸'۹) "وہ خدا کی محبت کی بنا پر مسکین' یتیم اور گرفتارِ بلا کو کھانا کھلاتے ہیں (اور نیت یہ رکھتے ہیں) کہ ہم تم کو اللہ کے لئے کھلا رہے ہیں' نہ تم سے بدلہ کے خواہاں ہیں نہ شکر گذاری کے"۔ پھر فرمایا: ھَا اَنْتُمْ ھٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَمِنْکُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ وَ مَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِہٖ وَ اللّٰہُ الْغَنِیُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (محمدؐ۔۳۸) "تم تو ایسے ہو کہ جب تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی دعوت دی جاتی ہے تو تم میں سے کچھ لوگ بخل کا مظاہرہ کرتے ہیں اور جو تنگ دلی کرے گا وہ تو اپنے آپ پر (خرچ کرنے پر) بخل کر رہا ہے' کیونکہ اللہ تو غنی ہے اور تم محتاج!"

معاشیات والے کہتے ہیں کہ ہر عملِ انفاق اضافی عمل (Multiplier Effect) سے کئی گنا قومی آمدنی کا موجب ہو جاتا ہے اور یہ کہ مال کا جمع کرنا اسی نسبت سے قومی آمدنی میں کئی گنا کمی کا باعث ہوتا ہے اور حدیث قدسی ہے: اَنْفِقْ نُنْفِقْ علیک

"خرچ کرائے بنی آدم تجھ پر خرچ کیا جائے گا"۔

کیفیتِ انفاق

کیا اور کیسے خرچ کیا جائے؟ فرمایا: وَيَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ۔ ۲۱۹) "اور یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ ان سے کہیے کہ جو ضرورت سے زائد ہووے دے ڈالو"۔ قانونِ الٰہی پر چلنے والوں کی ضرورتیں کیا ہوں گی؟ یہ نہیں کہا جا سکتا' کیونکہ ضرورت کی اشیاء (Necessaries) کی ایسی فہرست نہیں بنائی جا سکتی جو ہر طبقہ کے لئے کار آمد ہو۔ اقتصادیات میں ضروریات کو اضافی (Relative) قرار دیا گیا ہے جو ہر زمانہ' ہر ماحول اور معاشی درجات کے لحاظ سے مختلف ہوتی رہتی ہیں۔

اسلامی معاشرہ میں نہ خالی خولی نمود و ریا اور غرور و تکبر کے لئے گنجائش ہے' نہ مسلمان دولت کے بل پر غریبوں کے ضمیر اور عزتوں کے سودے کر سکتا ہے' نہ فساد برپا کر سکتا ہے اور نہ شراب' جُوا اور دیگر بے اعتدالیوں پر مال ضائع کر سکتا ہے' نہ وہ مخلوقِ خدا کو اپنی داد و دہش سے اپنی خدائی کا قائل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تو جب اسے حکم دیا گیا ہے کہ ضرورت سے زائد مال اپنے پاس نہ رکھو تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کو کس طرح خرچ کرے؟ جب کہ "لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا" (بنی اسرائیل۔۲۶) کے حکم کے مطابق جائز ضرورت پر بھی فضول خرچی یا اسراف منع ہے۔

قومی آمدنی اور قومی اخراجات (National Income and National Exp-enditure) ایک ہی مسئلہ کے دو رخ ہیں' یعنی ایک شخص یا طبقہ کے اخراجات سے دوسرے طبقہ کی آمدنی وجود میں آتی ہے' لہٰذا انفاق کی جائز صورت کو سمجھنے کے لئے صَرف کی جائز صورتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اسلام اس کے دو اصول بیان کرتا ہے: (۱) أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ" (المائدہ۔۵) "تمہارے لئے پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں"۔ (۲) لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ (النساء۔۲۹) "اپنے اموال آپس میں باطل طریقوں سے مت کھاؤ' مگر یہ کہ باہمی رضامندی سے لین دین ہو"۔ باطل کے مفہوم کو ناجائز یا باہمی نا رضامندی کے

لین دین سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ پیشہ وارانہ بھیک مانگنا' سُود' جُوا' احتکار کا منافع' چوری' رشوت کی کمائی وغیرہ سب کے سب اس میں شامل ہیں۔ تجارت میں اشیاء اور خدمات (Goods and Services) یعنی مال کی قیمت اور محنت کی اُجرت کا لین دین شامل ہے۔ "عَنْ تَرَاضٍ" کی شرط سے دھوکا' فریب' ملاوٹ' کم قیمت مال کو بہتر بتانا' کم تولنا' کم ناپنا' مزدور کی بے کسی و بے بسی سے فائدہ اٹھا کر محنتانہ میں کمی کرنا اور سٹہ بازی وغیرہ کے جتنے طریق آج کل مروّجہ ہیں سب کا استیصال مقصود ہے۔ اور جہاں ان ناجائز طریقوں سے کمانا منع ہے وہیں ان کا دوسرا فریق بننا بھی جرم ہے اور انفرادی و اجتماعی کوششوں سے ان افعال کو ناممکن بنانے کی کوشش مستحسن ہے۔

مقدّم الذّکر اصول میں پاک چیزوں کی حِلّت کی تخصیص کر کے کچھ نجس چیزوں کا استعمال ممنوع قرار دے دیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ بہترین رزق وہ ہے کہ اپنی محنت سے پیدا کیا جائے: مَا اَكَلَ اَحدٌ طَعامًا قَطّ خيرًا مِن اَنْ يَاكُلَ مِن عَمَلِ يَدِهِ "اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھانے والے سے کوئی بہتر خوراک نہیں کھاتا"۔ مزید فرمایا: لَا تَسْئَلُوا النّاسَ شَيْئًا "کسی سے کچھ نہ مانگو" اِلّا اَنْ يَسْئَلَ الرَّجُلُ سُلطانًا اَوْ فِي اَمْرٍ لَا بُدَّ مِنهُ "مگر یہ کہ کوئی شخص حکومت سے مانگ لے یا کسی امر مجبوری میں سوال کرے"۔ اور فرمایا: اَلْيَدُ الْعُلْيَا خيرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلىٰ یعنی دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

ان اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جو بھی خرچ کیا جائے گا وہ اللہ کی رضا مندی کے لئے سمجھا جائے گا۔ گویا مومن کا ہر خرچ انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ چنانچہ مشہور حدیث ہے: "اِبْدَاْ بِمَنْ تَعُولُ" "سب سے پہلے اپنے اہل و عیال کی جائز ضروریات پوری کرو"۔ اور قرآن مجید میں ارشاد ہوا: قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (البقرہ۔۲۱۵) "جب تم مال خرچ کرو تو وہ تمہارے والدین' اقربا' یتامیٰ' مساکین اور مسافروں کی کفالت کے لئے ہو"۔ ایسا خرچ کرنا گویا دونوں جہانوں میں جنّت کا سا سکون پیدا کر دے گا۔

خوشحالی کے زمانہ میں بھی خرچ کرنا چاہئے اور تنگی ترشی کے دنوں میں بھی۔ یعنی اس امر کا انتظار نہیں کرنا چاہئے کہ بنک میں ہزاروں روپے جمع ہو لیں تو خرچ کی ابتداء

کی جائے' جو اس ارشادِ خداوندی سے ظاہر ہے: وَسَارِعُوا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ○ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (آل عمران۔۱۳۳'۱۳۴) "اور اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف جلدی جلدی سے بڑھو اور اس جنّت کی طرف جو آسمانوں اور زمینوں کی وسعت رکھتی ہے اور متّقیوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ یعنی ان لوگوں کے لئے جو خوشحالی اور تکلیف دونوں حالتوں میں خرچ کرتے ہیں۔ غصّہ کو پی جانے والے اور لوگوں کے قصوروں کو معاف کردینے والے ہیں"۔ ایسے "متقیوں" کے لئے حسبِ ضرورت رزق کی ضمانت موجود ہے: وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا○ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق۔۲'۳) "اور جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے وہ اس کے لئے (مشکلات سے) نجات کی صورت پیدا کردے گا اور اسے ایسے ذریعہ سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہو گا"۔

اور اس تقویٰ و توکّل اور انفاق فی سبیل اللہ کے طریق سے اعراض کرنے والی قومیں آج کل جس ذہنی بے اطمینانی اور لا یعنیت کے فلسفۂ زندگی سے دو چار ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں کہ وہ ایک مسلسل خوف اور بے یقینی کی زندگی گذار رہے ہیں' بمصداق وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (طٰہٰ۔۱۲۴) "اور جو ہمارے ذکر سے غافل ہوا اس کی معیشت تنگ ہو گئی"۔ اور اس غیر اسلامی اقتصادی ماحول میں انسان کو کبھی برتری کا اور کبھی کمتری کا احساس کج روی پر مجبور کرتا ہے: فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ○ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ○ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ○ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ○ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا○ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا○ (الفجر: ۱۵ تا ۲۰) "تو جب انسان کو پروردگار آزمائش میں ڈالتا ہے اس کو عزت دے کر اور نعمت دے کر تو وہ (غرور سے) کہتا ہے مجھے میرے ربّ نے برتری عطا کی۔ اور جب اس کے رزق میں کمی کر کے اس کا امتحان لیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے مجھے میرے ربّ نے ذلیل کر دیا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں' حقیقت یہ ہے کہ تم (اپنے معاشرے کے) یتیموں کی عزت نہیں کرتے اور مسکینوں کو کھلانے پلانے پر ایک

دوسرے کو آمادہ نہیں کرتے' مرنے والے کی متروکہ جائیداد ساری کی ساری ہضم کر جاتے ہو (جائز ورثاء میں تقسیم نہیں کرتے) اور اپنی ساری خواہشات کا مرکز مال و دولت ہی کو بنا لیتے ہو"۔

گویا "عُسر و یُسر" کی ان ابتلاؤں کا حل ہی یہ ہے کہ مال کو محبت کا مرکز نہ بنا لیا جائے۔ دولت کے ارتکاز کو روکنے کے لئے اوّل تو اسے ورثاء میں تقسیم در تقسیم کر کے معاشرہ میں پھیلا دیا جائے' پھر یتیموں کو جو بے سہارا رہ جائیں سب لوگ اتنا دیں کہ وہ اپنا معزز مقام حاصل کر لیں' پھر بھی جو مسکین پایا جائے اور کسی وجہ سے زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے اس کو تلاش کر کے دوسروں کی مدد سے مال و دولت سے بے نیاز کر دیا جائے' تاکہ وہ بھی تمہارے شانہ بشانہ اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں سے برادری' قوم اور ملک کو مالا مال کرے۔ ایسے شخص کو کچھ دے کر اس سے شکریہ کی امید و آرزو کرنا یا معاوضہ طلب کرنا اس کی عزتِ نفس کو مجروح کرنا ہے۔ اس کو اس طرح سے دو گویا اس کو خود اللہ نے تمہارے ہاتھ سے دلوایا ہے۔

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ مسکین پیشہ ور گداگر کو نہیں کہتے' بلکہ مسکین باوجود کوشش کے اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکتا اور لوگوں سے مانگتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہے' صرف اس کے قریبی' ہمسائے یا قیافہ شناس لوگ ہی اس کے متعلق علم رکھتے ہیں۔ حدیث میں مسکین کی نشاندہی یوں کی گئی ہے کہ مسکین وہ نہیں جو گھر گھر ٹکڑے مانگتا پھرے بلکہ وہ ایسا شخص ہے جس کے پاس کھانے کو کچھ نہ ہو اور لوگوں کو اس کا حال ہی معلوم نہ ہو کہ اسے صدقات و خیرات دیں اور وہ کھڑا ہو کر سوال بھی نہ کرے۔ اور قرآن مجید میں یوں مذکور ہے: تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُمْ (البقرہ: ۲۷۳) "اور تم ان کی پیشانی سے ان کو پہچان لیتے ہو" یہ ہمیشہ یاد رہے کہ یہ لینا اور دینا ایک ایسے ماحول میں ہو کہ نہ کوئی دینے والا تکبر میں مبتلا ہو' نہ لینے والا ذلت محسوس کر کے حسد کی آگ میں رہے۔ حضورؐ نے فرمایا: تَوَاضَعُوا حَتّٰى لَا يَفْخَرَ اَحَدٌ عَلٰى اَحَدٍ وَلَا يَبْغِى اَحَدٌ عَلٰى اَحَدٍ "فروتنی اختیار کرو حتّٰی کہ (صاحبِ جاہ و حشمت) دوسروں پر تفاخر و تکبر نہ کر سکے اور (بے زر مفلس) دوسروں پر بغاوت نہ کرنے لگے"۔ کمانے والے کی ذاتی ملکیت کا بہرحال احترام رہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: "وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ

بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَ اسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ "(النساء ۔ ۳۲) "اور اس مال کی (حسد سے) تمنا نہ کرو جس کی وجہ سے اللہ نے تم سے کچھ لوگوں کو بعض دوسروں پر فضیلت عطا کی ہے۔ مرد ہو یا عورت جو کچھ انہوں نے کمایا ان کی ملکیت ہے"۔ اور ایک جگہ فرمایا: لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم ۔ ۳۹) "انسان کو وہی کچھ ملنا چاہیے جس کے لئے اس نے محنت کی ہو"۔

اور سرمایہ داری جرم نہیں' بلکہ دولت کی بنا پر دوسروں کو حقیر سمجھنا اور مال کے ساتھ جو قوت اور ایک طرح کی برتری حاصل ہو جاتی ہے اس کا ناجائز استعمال گناہ ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے: وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ○ (البقرہ ۔ ۲۷۹) "اور جب (سود وغیرہ سے) باز آ جاؤ تو یہ تمہارا سرمایہ تمہاری ملکیت ہے۔ نہ تم (اس کے ذریعہ) لوگوں پر ظلم کرو' نہ تم پر (سرمایہ سے محروم کر کے) ظلم کیا جائے"۔

یوں اسلامی معاشرہ ایک سرمایہ دار معاشرہ ہے' جس میں ذاتی ملکیت کو مکمل احترام حاصل ہے۔ دنیا کا فیشن کچھ ہی ہو جائے' جب تک ایک بھی مسلمان روئے زمین پر باقی ہے اسے اس یقین سے کوئی محروم کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ مگر وہ کس شان کی سرمایہ داری ہے' آیئے قرآن و حدیث کی روشنی میں دیکھیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱) لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا (النور ۔ ۶۱)

"اندھے ' لنگڑے ' لولے اور مریض پر (تمہارے گھروں سے کھا پی لینے میں) کوئی حرج نہیں۔ اور تم اپنے گھروں سے ' اپنے باپ دادا کے گھروں

سے ' اپنی ماؤں کے گھروں سے ' اپنے بھائیوں کے گھروں سے ' اپنی بہنوں کے گھروں سے ' اپنے چچاؤں کے گھروں سے ' اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے ' اپنے ماموؤں کے گھروں سے ' یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے بلا تکلف کھا پی سکتے ہو۔ (اس کے علاوہ) ان گھروں سے جن کی کنجیاں تمہارے اختیار میں ہوں یا اپنے دوستوں کے گھروں سے بھی کھا پی سکتے ہو۔ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اکٹھے کھاؤ پیو یا الگ الگ ہو کر"۔

(۲) فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ○ وَمَا اَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ○ فَكُّ رَقَبَةٍ ○ اَوْ اِطْعٰمٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ○ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ○ اَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ○ (البلد ۔ ۱۱ تا ۱۶)

"پس وہ (انسان) دشوار گذار گھاٹی پر نہ چڑھ سکا۔ اور تم کیا سمجھے کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ مبتلائے مصیبت کی گردن آزاد کرنا (یعنی غلامی کا انسداد) ' یا بھوک کے دنوں میں قریبی یتیم اور خاک میں ملے ہوئے مسکین کو کھلانا پلانا"۔

(۳) وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ○ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهُ ○ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهُ اَخْلَدَهُ ○ (الھمزہ ۔ ۱ ۔ ۳)

"اس طعنہ باز عیب چین پر افسوس ہے جو مال و دولت جمع کر کے اس کا حساب کرتا رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مال اس کا اس کے ساتھ ہمیشہ رہے گا"۔

(۴) مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ

"جو مال تمہارے پاس رہا وہ ختم ہو گیا ' مگر جو اللہ کے لئے دے دیا گیا وہ باقی رہ گیا"۔

(۵) اَلسَّاعِي عَلَى الْاَرْمَلَةِ وَالْمِسْكِينِ كَالْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ (متفق علیہ ' عن ابی ہریرہؓ)

"بیوہ اور محتاج کے آرام کی کوشش کرنے والا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی مانند ہے"۔

(۶) وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيمَ اَنْفَقَهٗ (رواہ الترمذیؒ عن

عبداللہ بن مسعودؓ)

"اور مال کے بارے میں (پوچھا جائے گا) کہ کہاں سے حاصل کیا اور کہاں خرچ کیا"۔

(۷) یَقُوْلُ ابْنُ اٰدَمَ مَالِی مَالِی وَھَلْ لَکَ یَا ابْنَ اٰدَمَ مِنْ مَالِکَ اِلَّا مَا اَکَلْتَ فَاَفْنَیْتَ اَوْ لَبِسْتَ فَاَبْلَیْتَ اَوْ تَصَدَّقْتَ فَاَمْضَیْتَ (رواہ مسلم والترمذی، عن عبداللہ بن الشخیرؓ)

"ابنِ آدم کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال ------ لیکن اے ابنِ آدم، تیرے مال میں سے تیرا کچھ بھی نہیں------ سوائے اس کے جو تو نے کھا پی لیا، پس اسے تو نے ختم کر دیا، یا جو کچھ تو نے پہن لیا پس اسے بوسیدہ کر دیا، یا جو تو نے صدقہ کر دیا پس اسے (آخرت کے لئے) محفوظ کر لیا"۔

اعلانِ داخلہ

(دینی تعلیم کا ایک سالہ کورس)

قرآن اکیڈمی کی ایک اہم تعلیمی اسکیم، ایک سالہ کورس کے پہلے سمسٹر میں (جو چھ ماہ پر محیط ہوگا) آئندہ داخلوں کے ضمن میں یہ بات نوٹ کر لی جائے کہ نظر ثانی شدہ پروگرام کے مطابق اب یہ داخلے تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع کے بعد یعنی اواخرِ اپریل میں ہوں گے لہٰذا داخلے کے خواہش مند طلبہ ۲۰ر اپریل تک اپنی درخواستیں بھجوا سکتے ہیں۔

واضح رہے کہ اس کورس میں ترجیحاً گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے، تاہم استثنائی صورت میں انڈر گریجویٹ طلبہ کی درخواستیں بھی زیر غور لائی جاسکتی ہیں۔

(نوٹ: تفصیلات کے خواہش مند حضرات دس روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر پراسپکٹس طلب کریں)

المعلن: ناظمِ قرآن کالج، ۱۹۱۔ اے، اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

خصوصیاتِ صحابہ کرامؓ
قرآن حکیم کی روشنی میں

مولانا سید اخلاق حسین قاسمی دہلوی

(۱) جماعتِ صحابہؓ کا اتحاد خدائی معجزہ تھا، جس نے صحابہ کرامؓ کے دلوں میں محبت پیدا کرکے انہیں اسلام کی عظیم قوتِ نافذہ بنا دیا۔
(۲) جماعتِ صحابہؓ میں حکمِ الٰہی کی اتباع فطری صفت تھی، جس نے جماعتِ صحابہؓ کو "اُمتِ مسلمہ" کا صحیح مصداق بنا دیا۔

یہ دو بنیادی صفتیں ہیں، جن کی روشنی میں صحابہ کرامؓ کا صحیح تعارف ہوتا ہے۔

(۱) جماعتِ صحابہؓ کا اتحاد

قرآن کریم نے جماعتِ صحابہؓ کے اتحاد و اتفاق کو جس فکر انگیز اسلوب میں بیان کیا ہے اس پر غور کرو:

" وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ، لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ، اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (الانفال: ۶۳-۶۴)

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: " اے نبی! اگر آپؐ دنیا کے تمام مادی وسائل خرچ کرکے بھی ان عربوں میں

اتحاد پیدا کرنا چاہتے تو نہیں کر سکتے تھے، لیکن اللہ تعالےٰ نے روحانی قوت کے ذریعہ وہ اتحاد قائم کر دیا۔

مادی وسائل، دولت اور حکومت کے ذریعہ سیاسی اتحاد پیدا ہوتا ہے جو سیاسی اغراض کے تحت وقتی اور عارضی ہوتا ہے۔ خدا تعالےٰ نے رُوحانی قوت سے اتحاد قائم کیا جو دلوں میں اُلفت اور محبت کی صورت میں نمودار ہُوا۔ دنیوی اغراض سے جو دل جُڑتے ہیں وہ جلدی ٹوٹ بھی جاتے ہیں اور قلبی محبت سے دِلوں میں جو جوڑ اور میل قائم ہوتا ہے وہ ناقابلِ شکست ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے ایک خدائی معجزہ کے ذریعہ جماعتِ صحابہؓ کو دینِ اسلام اور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے ایک ناقابلِ تسخیر قوت بنا دیا۔

میں اسے خُدائی معجزہ سے تعبیر کر رہا ہوں، کیونکہ اس میں تمام مخلوق کے ساتھ رسولِ پاکؐ کو بھی چیلنج کیا گیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں پیغمبری معجزہ، وہ ہے جس میں مخلوق کو چیلنج کیا جاتا ہے، جیسے قرآن کریم کے بارے فرمایا: وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (البقرہ:۲۳) یہ تعبیر کا فرق ہے، ورنہ معجزہ خدا کی وہ قوت ہے جو نبی و رسول کے ہاتھ پر اس کی صداقت کا نشان بن کر ظاہر ہوتی ہے۔

سورۂ آلِ عمران (آیت ۱۰۳) میں اس اتحاد کو خدا تعالیٰ کا عظیم انعام قرار دیا ہے:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔

"یاد کرو اللہ کی اس نعمت کو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اس نے تمہارے دلوں میں محبت پیدا کر دی اور تم اس کے فضل و کرم سے بھائی بھائی ہو گئے۔"

اتحاد کا نتیجہ

دعوت و تبلیغ کے میدان میں جماعتِ صحابہؓ کا اتحاد تیرہ سالہ مکی زندگی کے مظالم

شدائد میں دیکھا گیا۔ اس ظلم و تشدد کے دور میں مظلوم صحابہ رضؓ کے اندر اگر اتحاد اور تعاون نہ ہوتا تو یہ دور کیسے گذر سکتا تھا؟ سیاسی میدان میں اس اتحاد ہی کا معجزہ تھا کہ تین سو تیرہ کمزور اور بے سروسامان مسلمانوں نے ایک ہزار یعنی اپنے سے تین گنا مسلح فوج پر فتح حاصل کر لی — اور یہ حق کی پہلی فتح تھی۔ پھر اسی اتحاد کا نتیجہ تھا کہ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ کے نئے وطن میں غربت اور بے سروسامانی کی مشکلات پر قابو حاصل کیا گیا۔

صحابہ رضؓ کے درمیان مواخات

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضؓ کے اندر اس فطری اور الہامی جذبۂ اتحاد کو عملی شکل دینے کی غرض سے پہلے قریشی مسلمانوں (مہاجرین) میں مواخاۃ اور بھائی چارہ قائم کرایا اور پھر مدینہ منورہ تشریف لاکر مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کرائی۔ پھر مسلم معاشرہ کو ہر قسم کے رنگ و نسل اور خاندان و قبیلہ کے امتیازات سے پاک کر کے خالص توحید پر ایک امت بنانے کے بعد مدینہ کے غیر مسلموں (یہود) کے ساتھ ایک شہری معاہدۂ امن طے کیا۔ معاہدۂ اخوت اور معاہدۂ امن کی دفعات کو دیکھ کر دنیا کا ہر دانشور پکار اُٹھتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کامیاب ترین داعیٔ حق اور بے مثال اجتماعی و سیاسی مدبّر تھے۔

خدائی معجزہ : نبوّت کی طاقت

سورۃ الانفال (آیت ۶۴) میں جماعتِ صحابہ رضؓ کو خدائی نصرت کے بعد نبوّت کی طاقت قرار دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے آیت ۶۲ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کفایت کی طرف متوجہ کیا ہے کہ اگر دشمن آپ کو دھوکا دیں تو کوئی پرواہ کی بات نہیں، اللہ تعالیٰ آپ کے لیے کافی ہے۔ آیت ۶۴ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کفایت کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی کفایت پر بھی توجہ دلائی ہے۔

ہم اس اہم آیت کی تفسیر میں حضرت شاہ ولیؒ اللہ کی اختیار کردہ تاویل کو ترجیح دیتے ہیں۔ شاہ صاحب کا فارسی ترجمہ یہ ہے :

"اے پیغمبر! کفایت است ترا خدا و کفایت کنند ترا آنانکہ پیروی تو کردہ اند از مسلمانان۔"

مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے بھی حضرت شاہ صاحب کی ترکیبِ نحوی کو پسند کیا ہے۔ مولانا کا ترجمہ یہ ہے :

"اے نبیؐ! آپ کے لیے اللہ کافی ہے اور جن مومنین نے آپ کا اتباع کیا ہے وہ کافی ہیں۔"

یہ ترجمہ بصرہ کے اہلِ نحو کی ترکیب کے مطابق ہے۔ یہ حضرات "وَمَن" کا عطف قرب کی وجہ سے لفظ "اللہ" پر کرتے ہیں جبکہ دوسرے نحوی "حَسْبُكَ" کے کافِ خطاب پر کرتے ہیں، جس سے آیت کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ یعنی آپؐ کے لیے اور ایمان والوں کے لیے اللہ کافی ہے۔

صحابہ کرامؓ کے بارے میں اس خدائی اعلان کا سبب یہی ہے کہ صحابہ کرامؓ کو پہلی آیت میں خدائی معجزہ قرار دیا گیا ہے، ورنہ مادی اسباب کے لحاظ سے خدا تعالیٰ نے حضورؐ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ (الزمر: ۳۶)

"کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندۂ خاص (حضرت محمدؐ) کے لیے کافی نہیں ہے؟ پھر یہ مخالفین (اے نبی!) آپ کو غیر اللہ کی قوتوں سے کیوں خوف زدہ کرتے ہیں؟"

قرآن کریم نے کفایت و کافی ہونے کی وجہ (عبدیت خاص) بیان کرنے کی غرض سے یہ اسلوب اختیار کیا کہ پہلے فقرہ میں حضورؐ کو ضمیر غائب سے یاد کیا اور دوسرے فقرہ میں ضمیر خطاب لاکر آپؐ کو مخاطب فرمایا، ورنہ دونوں فقروں کے درمیان یکسانیت قائم کرنے کا تقاضہ یہ تھا کہ دونوں میں ایک ہی قسم کی ضمیریں لائی جاتیں۔

جماعت نہیں بلکہ عصابہ!

جماعتِ صحابہ رضؓ کے اس معجزانہ اتحاد کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کی مشہور دعا میں "عصابہ" کا لفظ استعمال فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اِنْ تُھْلِكْ ھٰذِہِ الْعِصَابَةَ لَنْ تُعْبَدَ اَبَدًا

خداوندا! اگر تُو نے اس مضبوط جماعت کو ہلاک کر دیا تو پھر قیامت تک تیری عبادت نہیں ہو سکے گی۔"

عصابہ، عصب (بمعنی پٹھہ) سے بنایا گیا ہے۔ جسم کے اندر پٹھا نہایت مضبوط ہوتا ہے، اِس لیے ایک مضبوط جماعت کو بھی عرب عصابہ کہتے تھے۔ تعصب بمعنی سختی بھی اسی سے ہے۔ جسم کا سب سے زیادہ مضبوط جزء 'عظم' (ہڈی) ہے، لیکن عرب عظم سے عظامہ نہیں بناتے، کیونکہ ہڈی میں لوزح نہیں ہوتا، یہ زور دینے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ جبکہ پٹھا نرم ہوتا ہے، لوچ کھا جاتا ہے۔

باہمی محبت کی روشن مثالیں!

صحابہ رضؓ کی پوری تاریخ باہمی محبت و الفت کی روشن مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ ذیل میں اختصار کی غرض سے صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

(۱) خاتونِ جنت سیدہ فاطمۃ الزہراءؓ کی تعریف میں حضرت عائشہ رضؓ کا قول:

حضرت عائشہ رضؓ سیدہ فاطمہ زہراءؓ کی عرفِ عام کے لحاظ سے سوتیلی ماں ہیں۔ ایک سوتیلی ماں اپنی سوتیلی بیٹی کی تعریف میں کیا کہتی ہے:

"ما رأیتُ احدًا کان اشبہُ سمتًا وھدیًا ودلًّا وکلامًا برسول اللہِ صلی اللہُ علیہ وسلم من فاطمۃ"

(مشکوٰۃ ۴۰۲)

عربی کے ان چار جامع لفظوں میں عرب کی ایک زبان دان خاتون نے اپنی ممدوحہ کو

رسول اکرمؐ کے ساتھ مکمل مشابہت دینے کی کامیاب کوشش کی۔ مقامِ نبوت کی انفرادیت اپنی جگہ ہے۔ تاریخ کی نزاعی بحثوں کو سامنے رکھ کر غور کرو۔ تعریف کرنے والی ماں کا دل اس بیٹی کی محبت میں کتنا مخلص ہے، آئینہ سے زیادہ صاف اور شفاف ہے۔

(۲) حضرت عمرؓ کی تعریف میں حضرت علیؓ کا قول

حضرت علیؓ کی تعریف کا واقعہ یہ ہے کہ ایک روز حضرت عمرؓ بیت المال کے خارش زدہ اونٹوں پر خارش کا تیل اپنے ہاتھ سے مل رہے تھے، دھوپ تیز تھی اور آپ کے سر پر رومال پڑا ہوا تھا۔ اس وقت اتفاق سے حضرت علیؓ اور حضرت عثمان غنیؓ ادھر آنکلے۔ حضرت علیؓ نے کہا:

"اے عمرؓ! یہ خدمت کسی غلام سے لے لی ہوتی!" حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"علی! قوم کا سردار قوم کا خادم ہی ہوتا ہے" (سیّد القوم خادمھم)۔

حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کو مخاطب کرکے فرمایا:

"حضرت شعیبؑ کی بیٹی نے جس اجیر و مزدور کی تعریف میں کہا تھا:

اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ ۝ (القصص: ۲۶) بہترین اجیر وہ ہے جو طاقت ور اور امانت دار ہو، اے عثمان! عمر ابن خطاب اس کا صحیح مصداق ہیں!!"

کیا ان تعریفوں میں اخلاص و للّٰہیت کا جذبہ محسوس نہیں ہوتا؟ کیا ان بلند اوصاف حضرات میں منافقت اور ریاکاری کا تصور کرنا انسانیت کی توہین نہیں؟ حضراتِ صحابہؓ کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ قرآن کریم نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کرنے والوں کی تعریف میں کہا:

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ (الصف: ۴)

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں

صف بستہ ہو کر، گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔"

اس کے مقابلہ میں منافقوں اور کافروں کے متعلق کہا گیا:

بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُونَ ۝ (الحشر: ۱۴)

"ان (دشمنانِ حق) کے اندر شدید قسم کا اختلاف اور سخت دشمنی ہے۔ (اے مخاطب!) تم ان کو متحد سمجھتے ہو، حالانکہ ان کے دل آپس میں پھٹے ہوئے ہیں، اور ان کا یہ حال اس لیے ہے کہ یہ عقل و دور اندیشی سے محروم ہیں۔"

دشمنانِ اسلام (کفارِ قریش ہوں یا مدینہ کے منافقین اور یہودی) کا رسولِ پاکؐ کے مقابلہ میں اتفاق و اتحاد کسی مثبت اصول پر قائم نہیں تھا، بلکہ مخالفتِ رسولؐ کے منفی تصور نے انہیں ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔ اور ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ کسی منفی مقصد پر اتفاق پائدار نہیں ہوتا۔ جبکہ ان کے مدِمقابل حضراتِ صحابہ کرامؓ کو ایک مثبت مقصدِ حیات (اسلام، اطاعتِ رسولؐ) نے اندر اور باہر دونوں جہتوں سے ایک فولادی دیوار بنا دیا تھا۔

(۲) جماعتِ صحابہؓ کی دوسری خصوصیت:

فطری حکم برداری، فطری اسلام

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا، سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ، ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ۔ (الفتح: ۲۹)

اس اہم آیت کے اس خاص فقرہ پر غور کرو: أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ

رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (سخت ہیں کافروں کے مقابلہ میں، رحمدل ہیں آپس میں۔)
سختی اختیار کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ان کے ساتھ ظلم و تشدد یا بدخلقی کا برتاؤ کرتے ہیں، بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ اپنے ایمان و عمل میں اتنے مضبوط ہیں کہ کسی دشمن کے خوف یا کسی دوست کے لالچ سے کمزور نہیں ہوتے، کسی سے دبتے نہیں۔ عربی میں "فلانٌ شدیدٌ علیہ" کا یہی مفہوم ہے۔ اس کے مقابلہ میں "رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ صحابہ کرام رضؓ حدودِ شرع کے دائرہ میں رہ کر آپس کے معاملات میں نرمی اختیار کرتے ہیں، ایک دوسرے بھائی کے ساتھ جھکاؤ اور شفقت کا معاملہ کرتے ہیں۔ جس طرح خدا تعالےٰ نے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا:

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (الشعراء: ۲۱۵)

"ایمان والوں میں جو آپ کی اتباع کرتے ہیں ان کے ساتھ تواضع اور نرمی کے ساتھ پیش آیا کیجئے۔"

مؤمنین کے ساتھ 'اتباع' کا لفظ اس لیے بڑھایا تاکہ واضح ہو جائے کہ مؤمنین سے کوئی خاص طبقہ یا خاص خاندان مراد نہیں ہے بلکہ جو بھی آپؐ کی اتباع کرے۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ نے اس نکتہ کو اپنے تشریحی حاشیہ میں واضح کیا اور فرمایا:

"شفقت میں رکھ ایمان والوں کو، اپنے ہوں یا پرائے۔"

شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا اجتہادی نکتہ

"اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" کی تفسیر کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ نے جو حاشیہ تحریر فرمایا ہے وہ بڑا فکر انگیز ہے۔ فرماتے ہیں:

"جو تندی اور نرمی اپنی خو ہو وہ سب جگہ برابر چلے، اور جو ایمان سے سنور کر آئے وہ تندی اپنی جگہ اور نرمی اپنی جگہ۔" (موضح القرآن ۸۵۲)

مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضؓ کی اصل فطرت نہ نرمی ہے اور نہ سختی ہے۔

فطری وصف ہر موقعہ پر نمایاں ہوتا ہے ۔ ان حضرات کی اصل فطرت تعمیل حکم ہے۔ ایمان باللہ نے ان حضرات کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے جسے قرآن کریم نے فرشتوں کا مقام قرار دیا ہے۔ یعنی :

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝

(التحریم : ۶)

ملائکہ کی فطرت اور مقصدِ تخلیق یہ ہے کہ وہ حکمِ الٰہی کی تعمیل کرتے ہیں۔ یہ بڑا نازک مقام ہے، اس لیے حضرت شاہ صاحبؒ نے بڑے ادب و احتیاط سے اس نازک مسئلہ کو بیان کیا ہے ۔ صحابہ کرامؓ بہرحال بشر تھے اور بشری لوازمات سے متصف تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے جس جماعت کو کارِ نبوت کے لیے قوتِ نافذہ بنایا ہو اس جماعت کو فطری طور پر اطاعت گذاری کے وصف پر قائم کر دیا۔ بشریت نے کبھی کبھی اپنا رنگ دکھایا، لیکن بشریت کے لوازمات مغلوب رہے۔

توحید کا تحفظ

صحابہ کرامؓ کے فطری اسلام کی وضاحت ہمیں حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کی زندگی کے تین اہم واقعات میں ملتی ہے، جن میں ان حضرات نے نہ صرف اسلام کے بنیادی رکن 'توحید' پر استقامت دکھائی، بلکہ توحیدِ الٰہی کے تحفظ کا حق ادا کیا۔

(۱) پہلا واقعہ حضرت عمرؓ کا حجرِ اسود کو خطاب کرنے کا ہے۔

(۲) دوسرا واقعہ صلح حدیبیہ کے ببول کے درخت کا کٹوانا ہے۔

(۳) تیسرا واقعہ حضرت عائشہؓ کا یہ کہنا کہ "بحمد اللہ لا بحمدک"

حضرت عمرؓ کا واقعہ یہ ہے کہ ایک روز کعبۃ اللہ کا طواف کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کا جذبۂ وحدانیت جوش میں آگیا۔ خیال آیا کہ اس مرکزِ توحید میں ایک پتھر کی یہ اہمیت کہ اسے چوما جا رہا ہے۔ عوام کے لیے یہ تعظیم فتنہ بن سکتی ہے، اس کا دروازہ بند کیا جائے۔ چنانچہ جوش میں آکر حجرِ اسود کو مخاطب کر کے فرمایا:

وَاللّٰہِ اِنَّکَ حَجَرٌ، لَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ (خدا کی قسم! اے حجرِ اسود، تُو صرف ایک بے اختیار پتھر ہے، تیری ذات سے نہ کسی کو نفع پہنچتا ہے اور نہ نقصان پہنچتا ہے!) اس نعرۂ وحدت میں حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی دعوتِ توحید کا جلال پوشیدہ تھا جب آپؑ نے فرمایا تھا: [1] وَتَاللّٰہِ لَاَکِیْدَنَّ اَصْنَامَکُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِیْنَ ۝ فَجَعَلَھُمْ جُذٰذًا اِلَّا کَبِیْرًا لَّھُمْ لَعَلَّھُمْ اِلَیْہِ یَرْجِعُوْنَ ۝ (الانبیاء: ۵۸، خدا کی قسم! تمہاری باطل عقیدت کو توڑنے کے لیے تمہارے جانے کے بعد میں ان بُتوں کی خبر لوں گا، چنانچہ ابراہیمؑ نے ایک بڑے دیوتا کو چھوڑ کر سب کا چُورا چُورا کر دیا۔) اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا: اے حجرِ اسود! مَیں تجھے اس لیے چُومتا ہوں کہ مَیں نے اپنے نبیؐ کو چُومتے دیکھا ہے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جس ببول کے درخت کے نیچے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعۃ الرضوان لی تھی، اس درخت کی لوگوں نے زیارت شروع کر دی تھی۔ وہ درخت بابرکت تھا، قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے (اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ) لیکن دورِ اوّل میں اس کی زیارت کا اہتمام مستقبل میں اس کی پرستش کی صورت پیدا کر سکتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس خطرہ کا احساس فرمایا اور عقیدۂ توحید کی حفاظت کی خاطر اسے کٹوا دیا۔ بزرگوں کے آثار کی تعظیم درست ہے، لیکن اگر اس میں عوام کی طرف سے عقیدت مندی کے غلو کا اندیشہ ہو تو اس میں حد درجہ احتیاط کرنا ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ کو فتح مکّہ کے موقع پر حضورؐ کا یہ ارشادِ گرامی یاد تھا کہ: "آج میرا بھی دل چاہتا ہے کہ مَیں لوگوں کو اپنے ہاتھ سے زم زم کا پانی پلاؤں اور یہ خدمت انجام دوں، لیکن مجھے یہ خطرہ ہے کہ میرے بعد لوگ اسے میری سنّت قرار دے کر اس پر عمل شروع کر دیں گے اور لوگوں کے لیے

---

[1] حضرت عمرؓ کے حجرِ اسود کو مخاطب کرنے کی جو تعبیر صاحبِ مضمون نے کی ہے، وہ کسی قدر محلِ نظر معلوم ہوتی ہے اور تحقیق طلب ہے۔ ضروری نہیں کہ ادارہ حکمتِ قرآن کو اس سے کامل اتفاق ہو۔

پریشانی پیدا ہو جائے گی۔"

تیسرا واقعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ہے۔ منافقین کی طرف سے لگائی جانے والی تہمت کے بعد جب رسولِ پاکؐ اور خانوادۂ صدیقؓ کے ایمان کی آزمائش پوری ہو گئی تو حضرت صدیقہ رضؓ کی صفائی میں قرآن کریم کی آیات نازل ہو گئیں۔ رسولِ اکرمؐ حضرت صدیقہ رضؓ کے پاس ان کے میکے میں تشریف لے گئے اور صدیقہ رضؓ کو بشارت سنائی۔ والدہ امّ رومان نے کہا:

" بیٹی کھڑی ہو جاؤ اور حضورؐ کا شکریہ ادا کرو۔"

حضرت صدیقہ رضؓ نے جواباً فرمایا: " لَا اَحْمَدُهُ وَلَا اَحْمَدُكُمَا وَلٰكِنْ اَحْمَدُ اللّٰهَ الَّذِي اَنْزَلَ بَرَاءَتِي " (میں نہ رسولِ پاکؐ کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور نہ آپ دونوں کا، بلکہ اس خدا کا شکر ادا کرتی ہوں جس نے میری صفائی میں قرآن نازل کیا۔)

حضرت صدیقہ رضؓ کے جواب میں گستاخی کا پہلو نہیں، بلکہ جلالِ توحید کا وہ رنگ ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے اس قول میں نظر آ رہا ہے جو ملائکہ سے فرمایا:

" حَسْبِي سُؤَالِي عِلْمُهُ بِحَالِي " (مجھے کسی کی امداد نہیں چاہیئے، میرا رب مجھے کافی ہے جو میرے حال سے واقف ہے۔) رسولِ پاکؐ نے بھی حضرت صدیقہ رضؓ کے جواب کو گستاخی نہیں سمجھا، بلکہ اسے شانِ توحید کے جلال پر محمول کیا۔ حضرت عائشہ رضؓ کے مزاج سے حضورؐ واقف تھے، آپؐ فرمایا کرتے تھے: عائشہ! میں تمہارے مزاج سے خوب واقف ہوں۔ جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو تو قسم کھاتی ہو: " وَرَبِّ مُحَمَّدٍ " (قسم ہے محمدؐ کے رب کی!) اور جب ناخوش ہوتی ہو تو کہتی ہو کہ " وَرَبِّ اِبْرَاهِيْمَ " (قسم ہے ابراہیمؑ کے رب کی!)

(جاری ہے)

بقیہ: حکمتِ اقبال

مجبوری سے نہیں کرتا بلکہ ایک ایسی خواہش سے کرتا ہے جسے وہ روک نہیں سکتا۔

بے تجلّی مردِ دانا رہ نبرد   از لکد کوبِ خیالِ خویش مُرد
بے تجلّی زندگی رنجوری است   عقل مہجوری و دیں مجبوری است

انسانی حقوق
سیرتِ طیبہ کی روشنی میں

از قلم: سید شبیر حسین زاہد

خلاقِ عالم نے انسان کی تخلیقِ حقیقی سے پہلے اس کی حاجتوں اور ضرورتوں کا خیال کرتے ہوئے کائنات اور اس کی نعمتیں پیدا کیں۔ انسان کی تخلیق اور اس کے ہبوطِ ارضی کے بعد جہاں خدائے بزرگ و برتر نے انسان کی روحانی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کی رہنمائی و ہدایت کے لئے انبیاء و صحائف کی تبعیث و تنزیل کا سلسلہ جاری کیا' وہاں انسان کی دنیاوی و جسمانی خواہشوں اور ضرورتوں کو سامنے رکھ کر اس کی تمام بنیادی مادی ضرورتوں کی فراہمی بھی اپنے اوپر واجب کر لی' مثلاً پانی' ہوا' رزق' زندگی' موت وغیرہ۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے زمین و آسمان سے انسانی ضرورتوں کی فراہمی کے اسباب و ذرائع مہیا فرما دیئے اور انہیں انسانوں کے لئے عام کر کے انسانی حقوق کی اہمیت کو واضح کر دیا۔ چنانچہ فرما دیا:

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرہ: ۲۹)

"زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا نے تمہارے (یعنی انسانوں کے) لئے پیدا کیا ہے"

انبیاء کرامؑ اپنے اپنے وقت پر ایک ایک کر کے آتے رہے[1] اور انسانی حقوق متعین کرتے رہے۔ بانیانِ مذاہب نے بھی انسانی حقوق متعین کئے اور مصلحین بھی انسانی حقوق کے تعین میں کوشاں رہے' مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی حقوق کی پامالی ہر دور میں ہوئی' انسان کو اس کے بنیادی حقوق سے محروم کیا گیا اور اس پر صرف "فرائض"

---

[1] وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر: ۲۴)" اور کوئی امت ایسی نہیں کہ جس میں کوئی ڈرانے والا نہ بھیجا گیا ہو"۔ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد: ۷) "اور ہر قوم کے لئے ایک ہادی (ہوا) ہے"۔

نافذ کر کے اس کے انسان ہونے کا مذاق اڑایا گیا۔

حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم جب مبعوث ہوئے تو عربوں میں اور غیر عربوں میں انسانی حقوق کی دھجیاں بکھری ہوئی تھیں۔ مثلاً باہمی حقوق مفقود تھے' ازدواجی زندگی میں میاں بیوی کے درمیان حقوق و فرائض کا تصوّر معدوم تھا' معاشرے میں مختلف طبقات کے حقوق کی کوئی پروا نہیں کرتا تھا' زور آور ہر احتساب سے آزاد تھا اور کمزور حقوق سے دُور اور فرائض کے بوجھ تلے کراہ رہا تھا' طبقۂ اناث مظلومیت کا شکار تھا' غلامی اور انسانی خرید و فروخت عام تھی' نہ رعایا کی کوئی شکل تھی اور نہ ہی اس کے کوئی حقوق متعین تھے' جو زبردست ہوتا تھا وہ حاکم بن جایا کرتا تھا' بچے محرومی کا شکار تھے اور لڑکیاں شرم و عار کا باعث ہونے کے سبب پیدا ہوتے ہی حوالۂ موت کر دی جاتی تھیں۔ ماں باپ' اقرباء' پڑوسی' مہمان' استاد و شاگرد' امیر و غریب' آجر و مستاجر' اور دوست دشمن سب حقوق سے نا آشنا تھے۔ غرضیکہ انسانیت کی تذلیل اور حقوقِ انسانی کی ناقدری و عدم ادائیگی ہر سطح پر عام تھی۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ما قبل مذاہب کی تعلیمات میں بھی انسانی حقوق کی کوئی متعین شکل نہ تھی۔ احکامات ایسے مبہم اور مُغلق تھے کہ کچھ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا۔[2] مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملہ کی نزاکت و اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ان کی تعیین ایسے تفصیلی' عام فہم اور مدبرانہ انداز میں کی کہ دوسروں کی تعلیمات اسلامی نقطۂ نظر کے سامنے ہیچ نظر آنے لگیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طریقوں سے حقوقِ انسانی کی تعلیم دی:

اوّل: تعلیماتِ قرآنی کی تبلیغ و تشہیر کر کے' جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے: اصلاحاتِ کبریٰ از ابو القاسم رفیق دلاوری' سیرتِ رسولؐ عربی از مولانا نور بخش توکلی' سیرت النبیؐ از شبلی نعمانی و سیّد سلیمان ندوی (جلد اول و ششم)' اسلام کے کارہائے نمایاں از پروفیسر غلام رسول' تصوراتِ عرب از عبید اللہ قدسی' سیرتِ سرورِ عالمؐ از مولانا مودودی جلد اول۔

[2] دیکھئے پرانا اور نیا عہد نامہ۔ مختلف احکام جو ایک دوسرے سے متضاد بھی ہیں اور مبہم بھی' مزید دیکھئے اظہارُ الحق از مولانا رحمت اللہ کیرانوی (تینوں جلدیں)

تھی۔

دوم: اپنے اقوال، ارشادات اور تقریری عمل[۴] سے لوگوں کو پابند کر کے۔

سوم: آپؐ کے اپنے پیش کردہ طرزِ زندگی اور معمولاتِ روز و شب میں حقوقِ انسانی کی نگہداشت اور آپؐ کا طرزِ عمل بھی امت کے لئے نمونہ ہدایت رہا اور رہے گا، جس کی پیروی کا حکم بھی قرآن میں دے دیا گیا تھا۔ یعنی: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:۲۱) "تمہارے لئے اللہ کے رسولؐ کی زندگی میں (پیروی کرنے کو) عمدہ نمونہ ہے"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تڑپتی، سسکتی، محروم، مقہور، مجبور اور استحصال زدہ انسانیت کو وہ سہارا دیا کہ انسانیت دوستی کا سب سے پہلا عملی ثبوت آپؐ نے اپنے قول و فعل سے پیش کیا اور اپنے احکامات، ارشادات، تعلیمات اور وصایا[۵] کے ذریعے اپنی امت کو حقوقِ انسانی کی بجا آوری کا پابند کر دیا۔ نہ صرف انسانوں کو ان کے حقوق سے بہرہ ور کیا بلکہ جانوروں تک کو بھی ان کے حقوق سے نوازا اور ان کے حقوق کے سلسلے میں انسانوں کو حکیمانہ تعلیمات دیں۔

اسلام کے معاشرتی اصول

چونکہ تمام انسان مل کر رہتے ہیں اور یہ اجتماعی بود و باش معاشرتی ماحول پیدا کرتی

---

۴ آپؐ کا ایسا عمل کہ آپؐ کوئی عمل ہوتا ہوا دیکھتے مگر اس پر ناراضی، ممانعت یا حوصلہ افزائی نہ فرماتے، بلکہ سکوت فرماتے۔ آپؐ کے سکوت کو ایک طرح کی رضامندی شمار کیا جاتا ہے۔ اور آپؐ کے اس طرز عمل کو تقریری کہا جاتا ہے (وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ (یونس-۴۷)

۵ احکامات سے مراد وہ احکام ہیں جو آپؐ نے حکم کے انداز میں امت کے لئے ارشاد فرمائے اور جن پر عمل فرض اور جن کا انکار کفر ہے۔ ارشادات آپؐ کے وہ اقوال وغیرہ ہیں جن میں آپؐ نے حقوقِ انسانی کے بارے میں ترجیحات، ترغیبات اور اجر و کرامت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اور ان پر عمل امت کی اپنی سہولت و مرضی پر چھوڑ دیا ہے، کوئی عمل کرے تو ثواب کا حقدار اور نہ کر سکے تو کوئی عذاب نہیں۔ وصایا سے مراد وہ احکامات و ارشادات ہیں جو خطبہ حجۃ الوداع سے لے کر وصال تک ارشاد ہوئے۔

ہے' لہٰذا اس سے پہلے کہ انسانوں کے مختلف طبقات کے حقوق کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات پیش کی جائیں' موزوں ہو گا کہ اسلام کے معاشرتی اصول اور اسلامی معاشرہ کے خدوخال مختصراً پیش کر دیئے جائیں' تاکہ انسانی حقوق کو سمجھنے سمجھانے کے لئے راہ ہموار ہو سکے۔ چنانچہ اس سلسلہ کی تعلیمات درج ذیل ہیں:

(۱) **تمام انسان برابر ہیں:** قرآن کا ارشاد ہے: **یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ** (الحجرات: ۱۳) "اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے' تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے"۔ حجتہ الوداع کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک تمہارا ربّ ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر' سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں' مگر تقویٰ کے سبب سے"۔ (بحوالہ مسند احمد)

(۲) **تمام انسان بھائی بھائی ہیں:** ارشاد الٰہی ہے: **اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ** (الحجرات: ۱۰) "بے شک تمام مومن بھائی ہیں"۔ انبیاء و رسل سے ارشاد ہوا: **اِنَّ ھٰذِہٖٓ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً** (المؤمنون: ۵۲) "اور تم سب ایک ہی جماعت ہو۔" رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں"۔ (مستدرک حاکم' طبری' ابن اسحاق) دوسری جگہ ارشادِ نبویؐ ہوا: "تم اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ"۔ (بحوالہ بخاری)

(۳) **آپس میں اتحاد و اتفاق:** اعلانِ الٰہی ہے: **وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا** (آل عمران: ۱۰۳) "سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو"۔ پھر ارشاد ہوا: "اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے (آپس میں) تفرقہ کیا اور اختلاف کیا"۔ (آل عمران: ۱۰۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "ایک مومن دوسرے مومن کے لئے ایسا ہی ہے جیسے کہ ایک عمارت' جس کا ایک جزو دوسرے جزو کو قوت دیتا ہے"۔ پھر آپؐ نے اپنی انگلیوں کو (آپس میں) ملا کر اپنے ارشاد کی تائید میں مثال بتائی۔ ایک اور حدیث میں ہے: "تو مومنوں کو ایک

دوسرے سے رحم، محبت اور مہربانی میں ایسا دیکھے گا جیسا کہ بدن میں ایک عضو بیمار ہو جائے تو تمام اعضاء بخار اور بیماری میں اس کے شریک ہو جاتے ہیں"۔(بخاری)

(۴) آپس میں ضرورتمندوں کی امداد و تعاون: آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک سائل آیا۔ آپؐ اس کی طرف متوجہ ہوئے (پھر صحابہؓ کی طرف توجہ کی) اور فرمانے لگے: "اس شخص کی مجھ سے سفارش کرو، تم کو ثواب ہو گا"۔ (بخاری)

(۵) آپس میں عدل و انصاف: ارشادِ خداوندی ہے: **اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ بِالۡعَدۡلِ** (النحل: ۹۰) "بے شک اللہ تمہیں عدل کا حکم دیتا ہے"۔ پھر ارشاد ہوا: "اللہ کے لئے انصاف کی گواہی دینے کو کھڑے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس (بات) پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف کے رستے سے ہٹ جاؤ"۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا: **اِعۡدِلُوۡا ہُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی** (المائدہ۔ ۱۸) "عدل کرو، یہ تقوی کے زیادہ قریب ہے!" سورۂ بنی اسرائیل (آیت ۳۳) میں انسانی جان کے قتل کی ممانعت کا حکم دینے کے ساتھ فرمایا: **اِلَّا بِالۡحَقِّ** یعنی اس حکم سے ایسا قتل مستثنیٰ ہے جو انصاف کے حصول کے لئے ضروری ہو۔

(۶) جان و مال اور آبرو کی حرمت: فرمانِ خداوندی ہے "اور (اپنے درمیان) کسی جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے، مگر یہ کہ انصاف چاہو" (بنی اسرائیل: ۳۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "تمہاری جانیں، تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسے کہ آج کے دن (یوم الحج) کی حرمت ہے"۔ (بخاری)

(۷) مذہبی آزادی: فرمانِ الٰہی ہے: **لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ** (البقرہ: ۲۵۶) "دین (کے سلسلے) میں (کسی پر) کوئی جبر نہیں ہے، ہدایت کی راہ گمراہی سے واضح ہو چکی ہے"۔

(۸) ملکیت میں اشتراک: ارشادِ خداوندی ہے: **وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ** (البقرہ: ۳) "اور جو ہم نے ان (متقین) کو دیا ہے اس میں سے (دوسروں کے لئے بھی) خرچ کرتے ہیں"۔ ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: "اور ان کے مالوں میں سوالی اور مانگنے والے محتاج کا حق ہے"۔ (الذّاریات: ۱۹)

(۹) کسی کو غلام نہ بنایا جائے: حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"وہ لوگ بہت بُرے ہیں جو آدمیوں کو (غلام بنا کر) فروخت کرتے ہیں"۔ (بخاری)

(۱۰) آپس کی ذمہ داری: حضور صاحبِ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "کُلُّکُمْ رَاعٍ وَ کُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ" (بخاری) "تم میں سے ہر ایک نگران اور ذمہ دار ہے۔ اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں بازپرس ہو گی"۔

(۱۱) تکریمِ انسانیت: قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: **وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ** (بنی اسرائیل: ۷۰) "اور یقیناً ہم نے بنی آدم کو بزرگی (تکریم وعزت) دی ہے"۔

(۱۲) ممانعتِ کینہ پروری: ارشادِ رسالتؐ ہے: **لَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا.....** الخ (بخاری) "آپس میں ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، نہ ایک دوسرے سے حسد کرو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو، اور سب مل کر خدا کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ"۔

(۱۳) آپس میں حقِ رحم: سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **مَنْ لَا یَرْحَمْ لَا یُرْحَمْ** (بخاری) یعنی جو (انسانوں پر) رحم نہیں کرتا اس پر بھی (خدا کی طرف سے) رحم نہیں کیا جاتا۔ یا کہ انسان بھی اس پر رحم نہیں کرتے۔ مستدرک حاکم میں ارشاد نقل ہوا ہے کہ "تم زمین والوں (عموماً کُل مخلوقات خصوصاً انسان) پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا"۔ بقول شاعر۔

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر　　خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر

(۱۴) آپس میں حُسنِ اخلاق کا حق: حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "اور لوگوں کے ساتھ حُسنِ اخلاق سے پیش آؤ"۔ (جامع ترمذی)

(۱۵) دوسروں کے لئے اپنی پسند کے معیار پر انتخاب کی پابندی: ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ باتیں گنائیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ **وَ اَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِکَ** (بخاری، دوم) "تم لوگوں کے لئے وہی کچھ چاہو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو"۔[1]

---

[1] تورات اور انجیل میں یہی تعلیم ان الفاظ میں آئی ہے کہ "تم اپنے پڑوسی (ساتھی) کو ایسا چاہو جیسا کہ تم اپنے آپ کو چاہتے ہو" بحوالہ سیرت النبیؐ از سید سلیمان ندوی ششم، ص ۲۹۹

(۱۶) حقِ صلح و ساز گاری: فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَصْلِحُوا ذَاتَ بَیْنِکُمْ (الانفال:۱) "پس خدا سے ڈرو اور اپنے باہمی معاملہ کی اصلاح کرو"۔ وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ..... لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ (الحجرات: ۹-۱۰) "اگر مسلمانوں کے دو فرقے آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔ اور اگر ایک (فرقہ) دوسرے پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرے اس سے لڑو' حتّٰی کہ وہ حکمِ خداوندی کی طرف رجوع کرے اور جب وہ رجوع کرے تو فریقین میں برابری کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کو ملحوظ رکھو۔ بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ تو اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو اور خدا سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے"۔

(۱۷) امر بالعروف و نہی عن المنکر: قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وَ لْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ (آل عمران: ۱۰۴) "تم میں سے ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہئے جو لوگوں کو نیک کام کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کو کہے اور برے کاموں سے منع کرے"۔ مزید ارشاد ہوا: کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ..... وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ (آل عمران: ۱۱۰) "تم بہترین امّت ہو جسے لوگوں (کی رہنمائی) کے لئے برپا کیا گیا ہے۔ تم اچھے کام کرنے کے لئے کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "تم میں سے جو کوئی بری (نامشروع) بات دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے مٹا دے اور ہاتھ سے نہ مٹا سکے تو زبان سے مٹا دے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل میں بُرا جانے۔ یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے"۔ (صحیح مسلم)

(۱۸) آپس میں حق گواہی: قرآن میں ارشاد ہوا ہے: "اے لوگو! گواہی کو نہ چھپاؤ' جو اس کو چھپائے گا تو اس کا دل گنہگار ہے"۔ (البقرہ: ۲۸۳) ایک اور جگہ ارشاد ہوا: "اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو"۔ (النساء: ۱۳۵) پھر ارشاد ہوا: "اور (خدا کے خاص بندے وہ ہیں) جو جھوٹی گواہی نہ دیں" (الفرقان: ۷۲) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خیانت کرنے والے مرد اور خیانت کرنے والی عورت کی گواہی مقبول نہیں' اور نہ اس کی جس پر حد لگائی گئی ہو' اور نہ اس کی جو اپنے بھائی سے کینہ رکھتا ہو' اور نہ اس شخص

کی جو ولاء اور قرابت میں متہم ہو' اور نہ اس شخص کی اپنے خاندان کے متعلق گواہی مقبول ہے جس کا خرچ اس خاندان پر منحصر ہے"۔[ک]

(۱۹) پابندیٔ عہد کا حق: حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَاَوْفُوا بِالْعَهْدِ** (بنی اسرائیل: ۳۴) "اور عہد کو پورا کیا کرو"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **لَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ** (مشکوٰۃ) "جس میں عہد نہیں اس میں ایمان نہیں"۔ حضور علیہ السلام کا قبل از نبوت ایک کاروباری عہد کی پابندی میں تین دن تک کھڑے رہنا بھی منقول ہوا ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر پابندیٔ عہد کی متعدد مثالیں سامنے آتی ہیں۔

(۲۰) آپس میں رازوں کی حفاظت کی پابندی: حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: تم دوسروں کے عیوب کی پردہ پوشی کرو' اللہ تعالیٰ (جو ستّار ہے) تمہارے عیوب پر پردہ ڈالے گا"۔ (بخاری) پھر فرمایا: "مجلسوں میں جو باتیں کی جائیں وہ امانت ہیں"۔ ایک اور موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: "سب سے بدترین خائن وہ ہے جو رات کو اپنی بیوی (یا بیوی خاوند) کے پاس لیٹے اور دن میں اس کا تذکرہ کرے"۔ (مسلم)

(۲۱) تکفیربازی سے اجتناب: باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا** (النساء: ۹۴) "اور جو شخص تم پر سلام کا اظہار کرے تو تم اس سے یہ نہ کہو کہ تم مسلمان نہیں"۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "جب کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو کافر کہتا ہے تو کفر ان دونوں میں سے کسی ایک پر لوٹ آتا ہے"۔

(۲۲) آپس میں جھگڑے کی ممانعت: خدا تعالیٰ فرماتا ہے: **وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ** (انفال: ۴۶) "اور آپس میں جھگڑا نہ کرو (اگر ایسا ہو گا تو تم) ہمت ہار جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی" (یعنی رعب ختم ہو جائے گا) پھر فرمایا کہ "اختلاف (و

ک چونکہ ان گواہوں میں تمام کے تمام عیوب ایسے ہیں جو حقوقِ انسانی کے استحصال اور ضرر پر محیط ہیں' اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو "شرفِ گواہی" سے محروم کر دیا ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ النور میں بھی ایسے افراد کا تذکرہ موجود ہے جو حقوقِ انسانی میں رخنہ ڈالنے کے سبب تا ابد گواہی کے حق سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔

جھگڑا بازی) سے بچو کہ پہلی اقوام اختلاف ہی کی وجہ سے تباہ ہوئی تھیں۔" (بخاری)

(۲۳) غیبت کی ممانعت: ارشادِ الٰہی ہے: "اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں کوئی ایسا ہے جو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے؟" (الحجرات: ۱۲) حضور علیہ الصلوۃ و السلام نے ارشاد فرمایا: "غیبت کرنا اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا ہے اور جس نے غیبت سنی گویا اس نے (خود) غیبت کی"۔

(۲۴) آپس میں خیر خواہی: خدا تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا (الحشر) "اے ربّ! ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ نہ رہنے دے"۔ نبی کریم علیہ الصلوۃ و التسلیم کا ارشاد ہے: "ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرے، نہ اس کو بے مدد چھوڑے اور نہ اس کی تحقیر کرے" (صحیح مسلم) پھر فرمایا: "وہ (مسلمان) نہ تو اس (دوسرے مسلمان) پر ظلم کرے، نہ اس کو اس کے دشمن کے حوالہ کرے" (سنن ابی داؤد) پھر ارشاد ہوا: "مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں" (بخاری) مزید فرمایا گیا: "اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں لگا رہتا ہے جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے" (سنن ابی داؤد)۔ "مسلمان کو گالی دینا فسق ہے" (بخاری)۔ "حسد سے بچو کہ یہ نیکیوں کو یوں کھا جاتا ہے جیسے سوکھی لکڑی کو آگ" (ابو داؤد)۔ "اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم" (بخاری)۔ پھر اس فرمان کی وضاحت فرمائی کہ ظالم ہونے کی صورت میں اسے ظلم سے روکو، یہ اس کی مدد ہو گی۔

(۲۵) مجموعی حقوق: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہر مسلمان پر اس کے مسلمان بھائی کے پانچ حق ہیں۔ اوّل سلام کا جواب دینا، دوم اس کے چھینکنے پر "یرحمک اللہ" کہنا، سوم اس کی دعوت کو قبول کرنا، چہارم بیمار ہو تو عیادت کو جانا، پنجم مرجائے تو جنازہ کے ساتھ چلنا" (سنن ابی داؤد) بخاری کی روایت میں اس پر دو کا اضافہ ہے۔ یعنی "امدادِ مظلوم اور ایفائے عہد"۔

مختصراً یہ پچیس حقوق باہمی طور پر مسلمان رعایا کے آپس کے حقوق ہیں، جو انفرادی طور پر ہر فرد پر لازم ہیں۔ سرکارِ دو عالمؐ نے قرآنی تعلیمات اور اپنے اسوۂ حسنہ کے ذریعے ان کی پابندی کو ضروری قرار دیا ہے تاکہ مسلم معاشرہ امن و سکون، بھائی چارہ، ہمدردی، راست روی اور تقویٰ کی آماجگاہ بنا رہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق

حضرت آدم علیہ السلام سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم تک جتنے بھی انبیاء و رُسل آئے وہ مکمل طور پر بشری حالت میں آئے۔ اگرچہ ان کی بشریت اور عام بشریت میں کوئی نسبت ہی ممکن نہیں مگر پھر بھی یہ سنتِ الٰہیہ رہی ہے کہ انسانوں کی طرف انہی میں سے ایک انسان کو رسول بنایا گیا یا نبی مقرر کیا گیا۔[۵] اس لئے انسانوں کے حقوق کا تذکرہ کرتے وقت بہتر ہے کہ سب سے پہلے انبیاء کے حقوق پر ایک نظر ڈالی جائے کہ حفظِ مراتب کے اعتبار سے انبیاء کا مقام انسانوں میں سب سے بلند اور حضورؐ کا مقام بالخصوص "بعد از خدا" ہے۔ تو آیئے ذرا نبیؐ کے حقوق پر ایک نگاہ ڈالیں:

(الف) اطاعت و تسلیمات:

۱۔ "(اے رسولؐ اللہ) آپ یہ فرما دیں کہ اللہ اور (اس کے) رسولؐ کی اطاعت کیا کرو' پھر اگر وہ لوگ اعراض کریں تو اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتا"۔ (آل عمران: ۳۲)

۲۔ "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی تو اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی"۔ (النساء: ۸۰)

۳۔ "(اے مسلمانو!) جو چیز تم کو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) دے دیا کریں لے لیا کرو اور جس چیز سے تم کو منع کریں اس سے رک جایا کرو!" (الحشر: ۷)

۴۔ حضورؐ کا ارشاد ہے: "جس نے میری اطاعت کی تو اس نے خدا کی اطاعت کی اور

---

۵ قرآن حکیم میں اس موضوع پر تفصیل و تشریح موجود ہے' چنانچہ فرمایا گیا ہے: (۱) لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا (آل عمران: ۱۶۴) "مومنوں پر اللہ کا فضل ہے کہ (اس نے) انہی میں سے ایک رسولؐ مبعوث کیا" (۲) وَ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا.... مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَ يَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ (المومنون: ۳۳) "(منکرینِ حضرت ہودؑ نے کہا) یہ شخص کچھ بھی نہیں ہے بس ایک بشر ہے تم ہی جیسا' جو کچھ تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو' وہی یہ پیتا ہے"۔ (۳) وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا (الانبیاء۔ ۷) "اے نبیؐ! ہم نے تم سے پہلے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا ہے"۔ (۴) "اے نبیؐ! تم سے پہلے ہم نے جو بھی پیغمبر بھیجے تھے۔ وہ سب انسان ہی تھے۔" (سورۃ یوسف: ۱۰۹)

جس نے میری نافرمانی کی تو اس نے خدا کی نافرمانی کی"۔ (بحوالہ کتاب الشفا از قاضی عیاضؒ)

(ب) بیعت:

۱۔ "بیشک وہ لوگ جو (صلح حدیبیہ کے وقت) آپؐ سے بیعت کر رہے ہیں وہ خدا ہی سے بیعت کر رہے ہیں۔ خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے"۔ (الفتح: ۱۰)

۲۔ "بے شک اللہ ان مسلمانوں سے خوش ہو گیا ہے جب کہ یہ لوگ آپؐ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے اور ان کے دلوں میں جو اخلاص تھا وہ بھی اللہ کو معلوم تھا" (الفتح: ۱۸)

(ج) عدمِ مخالفت:

۱۔ "جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کرتے ہیں وہ سخت ذلیل لوگوں میں سے ہیں"۔ (المجادلہ: ۲۰)

(د) آداب:

۱۔ "اے ایمان والو! تم اپنی آوازیں پیغمبرؐ کی آواز سے بلند نہ کیا کرو اور نہ ان کے ساتھ بہت زور سے بات کرو جیسے کہ تم آپس میں کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تمہیں (اس کا) شعور ہی نہ ہو"۔ (الحجرات: ۲)

(ہ) اتباعِ سنّت:

۱۔ "(اے نبیؐ!) آپ (لوگوں سے) فرما دیں کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کرے گا" (آل عمران: ۳۱)

۲۔ "یقیناً تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسولؐ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے"۔ (الاحزاب ۲۱)

(و) احترامِ ازواجِ مطہرات:

۱۔ "نبیؐ مؤمنین کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں اور آپؐ کی

ف مولانا اشرف علی تھانوی نے "نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیبؐ" میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ: "میری قبر پر آؤ تو مجھے ایسے مخاطب نہ کرنا جیسے تم اپنے مردوں کو پکارتے ہو، بلکہ میرا ادب زندہ کی حیثیت سے ہی کرنا"۔ (ص ۲۸۸)

بیبیاں ان (مؤمنین) کی مائیں ہیں"۔ (الاحزاب: ۶)

۲۔ "اے مسلمانو! پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر (بلا اجازت) نہ جایا کرو، مگر جب تمہیں کھانے کے لئے اجازت دی جائے .... (اور وہ بھی) عین وقت پر اور جب کھانا کھا چکو تو اٹھ کر چلے جایا کرو" (الاحزاب: ۵۳)

(ز) ایذا دہی سے بچنا:

۱۔ "بیشک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کو کسی طرح کی تکلیف دیتے ہیں ان پر دنیا و آخرت دونوں میں خدا کی لعنت ہے اور اللہ نے ان کے لئے رُسوا کُن عذاب تیار کر رکھا ہے" (الاحزاب: ۵۷)

۲۔ "اے مسلمانو! ان لوگوں جیسے نہ بنو جنہوں نے موسیٰؑ کو ایذا دی تھی (الزام تراشی کر کے)"۔ (الاحزاب: ۶۹)

۳۔ "اور جو لوگ اللہ کے رسولؐ کو تکلیف دیتے ہیں ان کے لئے درد ناک عذاب ہے"۔ (التوبہ: ۶۱)

(ح) ممانعتِ استہزاء:

۱۔ آپ (ان منافقین کو) فرما دیں کہ اچھا تم استہزاء کئے جاؤ"۔ (التوبہ: ۶۴) سورۃ البقرہ میں بھی منافقین کا مؤمنوں کے ساتھ استہزاء آمیز رویہ کا ذکر کیا گیا ہے، مؤمنوں میں پیغمبر علیہ السّلام بھی شامل ہیں۔

(ط) حمایت و نُصرت:

۱۔ "مدینے کے رہنے والوں اور گردوپیش کے دیہاتیوں کو یہ زیبا نہ تھا کہ وہ رسولؐ اللہ کا ساتھ نہ دیں، اور نہ یہ کہ اپنی جانوں کو ان کی جان سے عزیز سمجھیں" (التوبہ: ۱۲۰)

۲۔ پس جو لوگ اس نبیؐ پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور اتباع کرتے ہیں اس نُور کی جو اس نبی کے ساتھ اتارا گیا یہی لوگ مُفلحون ہیں"۔ (الاعراف: ۱۵۷)

(ی) درود و سلام:

۱۔ "بیشک اللہ اور اس کے فرشتے پیغمبرؐ پر درود و سلام بھیجتے رہتے ہیں، تو اے مسلمانو! تم بھی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود و سلام بھیجتے رہو" (الاحزاب: ۵۶)

۲۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب کوئی مؤمن مجھ پر ایک دفعہ درود

بھیجتا ہے تو اللہ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتا ہے' دس گناہ معاف کرتا ہے اور دس درجے بلند کرتا ہے"۔ (نشر الطیب بحوالہ نسائی)

(ک) روضۂ مبارکہ کی زیارت:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جو خانۂ کعبہ کا حج کرے اور میری قبر کی زیارت نہ کرے وہ مجھ پر ظلم کرتا ہے"۔ (ترمذی)

(ل) افراط و تفریط کی ممانعت:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مجھے دوسرے نبیوں پر فضیلت نہ دو' اگرچہ میں قیامت کے دن تمام بنی آدمؑ کا سردار ہوں گا اور میں ہی سب سے پہلا شخص ہوں گا جس کی قبر شق ہو گی۔ سب سے پہلے میں ہی لوگوں کی شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری ہی شفاعت مقبول ہو گی" (مسلم)۔ آپؐ نے وصیت کی: "ایسا نہ ہو کہ میرے بعد میری قبر کو سجدہ گاہ بنا لو"۔ (ترمذی)

(م) نسبتِ جھوٹ کی ممانعت:

حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: **فَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ** (ترمذی) "اور جو جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ کی تہمت لگائے تو اسے اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنا لینا چاہئے"۔

(ن) عدمِ تفرقہ:

۱۔ "اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا نہ سمجھا تو ایسے ہی لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ان کے اجر عطا فرمائے گا"۔ (النساء: ۱۵۲)

(س) تمام انبیاء پر یکساں ایمان اور ان کی کتابوں پر ایمان:

۱۔ "اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ اور اس کتاب کے ساتھ جو اس نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمائی اور ان کتابوں کے ساتھ جو پہلے نازل ہو چکی ہیں اعتقاد رکھو اور جو شخص اللہ' اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں' اس کے رسولوں اور روزِ قیامت کا انکار کرے تو وہ شخص بہت بڑی گمراہی میں جا پڑا"۔ (النساء: ۱۳۶)

۲۔ "بے شک جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے منکر ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے

(باقی صفحہ ۶ پر)

خودی کا اقبال (۳)

خدا کو پانا اپنے آپ کو پانا ہے

انسان کا خدا کی جستجو کرنا درحقیقت اپنی ہی جستجو کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے ہاں خدا کو تلاش کرنا یا اپنی خودی کو تلاش کرنا، خدا کی خودی میں گم ہونا یا اپنی خودی میں گم ہونا، خدا کی خودی کو گم کرنا یا اپنی خودی کو گم کرنا، خدا کی خودی میں ڈوبنا، یا اپنی خودی میں ڈوبنا، خدا کی نمود ہونا یا انسان کی نمود ہونا، خدا کا انسان کو بے حجاب کرنا یا انسان کا خدا کو بے حجاب کرنا، خدا کو فاش دیکھنا یا خودی کو فاش دیکھنا، خدا کو دیکھنا یا اپنے آپ کو دیکھنا، خدا سے خودی کو طلب کرنا یا خودی سے خدا کو طلب کرنا، خدا کے ساتھ خلوت گزیں ہونا یا اپنے آپ کے ساتھ خلوت گزیں ہونا، خدا کے نور سے اپنے آپ کو منوّر کرنا یا اپنے نور سے اپنے آپ کو منوّر کرنا، خدا کی طرف گامزن ہونا یا اپنی طرف گامزن ہونا، خدا سے پیوستہ ہونا یا اپنے آپ سے پیوستہ ہونا، ایک ہی حقیقت کو بیان کرنے کے مختلف پیرائے اور ایک ہی عمل کی مختلف تعبیرات ہیں۔

نمود تیری نمود اس کی، نمود اس کی نمود تیری — خدا کو تو بے حجاب کر دے، خدا تجھے بے حجاب کر دے

اگر خواہی خدا را فاش بینی — خودی را فاش تر دیدن بیاموز

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبتِ آشنا طلب — ہم ز خدا خودی طلب، ہم ز خودی خدا طلب

محکم از حق شو سوئے خود گام زن — لات و عزّیٰ ہوس را سر شکن

چناں باذاتِ حق خلوت گزینی — کہ او بیند ترا، او را تو بینی

تو ہم بذوقِ خودی رس کہ صاحبانِ طریق — بریدہ از ہمہ عالم بخویش پیوستند

اگرچہ خدا ہونے کا احساس خودی کا ایک عارضی تجربہ ہوتا ہے تاہم وہ ان معنوں میں عارضی نہیں ہوتا کہ اس تجربہ کے منقطع ہونے اور اپنی معمولی حالت کی طرف عود کرنے کے بعد خودی کا یہ تغیر صاف طور پر نظر آتا ہے کہ خودی اس تجربہ کی وجہ سے مستقل طور پر خدا کی صفات کے رنگ سے رنگین اور خدا کے اخلاق سے متخلق ہو گئی ہے اور خدا کی دنیا کو بھی اس طرح سے بدلنا چاہتی ہے جس طرح سے خدا خود اسے بدلنا چاہتا ہے۔ گویا مستقل طور پر خدا کی معاون بن گئی ہے۔ اہلِ مغرب سے تو یہ توقع ہی نہیں کہ وہ فطرتِ انسانی کے اسرار و رموز کو خود بخود سمجھ سکیں گے، لیکن مشرق میں بھی اس حقیقت کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے کہ ہر انسان کی خودی وہ مقام حاصل کر سکتی ہے جو ایک وقت میں منصور حلاج نے پایا تھا اور جسے پانے کے بعد اس نے 'انا الحق' کہا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر انسان کی خودی اپنی قدرتی نشوونما کے نتیجہ کے طور پر بالآخر ایک ایسے مقام پر پہنچتی ہے جہاں وہ خدا ہونے کا احساس کرتی ہے اور اس کے بعد وہ خدا کی دنیا کو بھی اسی طرح سے بدلنا چاہتی ہے جس طرح خدا اسے بدلنا چاہتا ہے۔ اگر اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیا جاتا تو آج یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی کہ بعض لوگ تو خدا سے بیزار ہیں اور بعض لوگ جو خدا کے عرفان کے مدّعی ہیں اپنی خودی کی نفی کرتے ہیں اور اپنے عرفان کو اپنی خودی کے استحکام اور اثبات کے لیے خدا کی نیابت کا احساس پیدا کرنے کے لیے اور خدا کی دنیا کو بدلنے کے لیے ایک زبردست قوّت کے طور پر کام میں نہیں لاتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ انسان اب تک اس دنیا میں مشرق کے زیرِ قیادت نوعِ بشر کی تکمیل کا وہ کردار ادا نہیں کر سکا جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ اقبال حلاج کی زبان سے ہمیں بتاتا ہے کہ اب مشرق میں ایک مردِ قلندر نے اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیا ہے اور وہ خود اقبال ہے۔ اقبال کا پیغام یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو بیکار نہ کرے۔ خدا کے حضور میں محکم اور استوار رہے اور اس کے بحرِ نور میں ناپید نہ ہو جائے تاکہ دنیا میں خدا کی مرضی کو پورا کر سکے۔

بخود محکم گذر اندر حضورش — مشو ناپید اندر بحرِ نورش

شاہدِ ثالث بشعورِ ذاتِ حق — خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق
پیشِ ایں نورار بمانی استوار — حیّ و قائم چوں خدا خود را شمار

بے ذوقِ نمودِ زندگی موت — تعمیرِ خودی میں ہے خدائی!

اقبال نے سنائی اور رومی کی ایک گفتگو کے پیرایہ میں اپنے اس پیغام کی اہمیت کا خود ذکر کیا ہے۔ اس پیغام کا چرچا فردوس میں بھی ہے چنانچہ وہاں سنائی رومی سے کہتا ہے کہ مشرق میں ابھی تک تو وہی بیکار فلسفۂ زندگی رائج ہے جو پہلے تھا لیکن حلاج (جس نے انا الحق کا نعرہ لگایا تھا اور جو اس بنا پر خوب سمجھتا ہے کہ انا الحق کہنے کے معنی کیا ہیں) یہ روایت کرتا ہے کہ مشرق میں ایک مردِ قلندر نے خودی کا یہ راز فاش کر دیا ہے کہ تعمیرِ خودی میں خدائی ہے یعنی تعمیرِ خودی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خدا کے اوصاف اور اخلاق اختیار کرتا ہے اور خدا ہی کی طرح دنیا کو بدلنا چاہتا ہے۔

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ، وہی آش!
حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش!

خودی کا یہ احساس کہ وہ خدا ہے عارضی ہونے کے باوجود خودی کے اندر ایک عظیم الشان مستقل انقلاب پیدا کر جاتا ہے جس کے بعد خودی کے لیے ایک بالکل ہی نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ خودی کے اس انقلاب کے مختلف پہلو حسبِ ذیل ہیں۔

غیر اللہ سے مکمل کنارہ کشی خودی کی قوت کا راز

چونکہ خودی میں خدا کے سوائے اور کسی چیز کی خواہش باقی نہیں رہتی، خودی کا عمل غلط خواہشات اور تصورات کے اثر سے پوری طرح سے آزاد ہو جاتا ہے، اور خودی خدا کی محبت کے لیے نہایت آسانی کے ساتھ ہر قسم کی تکلیفیں اٹھا سکتی ہے بلکہ اس قسم کی تکلیفوں کا کوئی احساس اس میں باقی نہیں رہتا۔ اقبال کی اصطلاح میں فقرِ خودی کی اس حالت کا نام ہے جب وہ غیر اللہ سے پوری طرح بے تعلق ہو کر خدا سے اپنا تعلق جوڑ لیتی ہے۔ جب تک خودی فقر کے اس مقام کو نہیں پاتی، یعنی جب تک اس کی ساری محبت باطل تصورات سے (جن میں انسان کی اپنی سفلی خواہشیں اور الفتیں بھی شامل ہوتی ہیں) کٹ کر خدا کے لیے نہیں ہو جاتی، خودی خدا سے پورا قرب حاصل نہیں کر سکتی اور اس پر خود فراموشی اور مستی و سرور کی وہ کیفیت وارد نہیں ہوتی جسے اقبال خودی میں ڈوبنے سے تعبیر کرتا ہے۔

اس کیفیت کا وارد ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اب خودی کی ساری محبت غیر اللہ سے کٹ کر کلیتہً اللہ کے لیے ہوگئی ہے۔ لہٰذا خودی جب اس حالت سے عود کرتی ہے تو اپنی محبت کا سارا خلوص اور اپنی ساری یک بینی، یک اندیشی اور یک باشی جن کی وجہ سے وہ اس حالت تک پہنچتی ہے اپنے ساتھ لاتی ہے۔ پھر وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتی جو خدا نہ چاہتا ہو۔ اور بڑے سے بڑے خطرے کے باوجود کسی ایسے کام سے رُک نہیں سکتی جو خدا چاہتا ہو۔ وہ چاہتی ہے کہ دنیا کی تمام قوتوں کو مسخر کر کے باطل کو فنا کرنے اور حکمِ حق کو جاری کرنے کے لیے کام میں لائے اور وہ اس غرض کے لیے ہر خطرہ کو مول لینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ شک اور خوف کی تمام قسمیں اس سے رخصت ہو جاتی ہیں اور وہ ایک بے پناہ قوتِ عمل کی مالک بن جاتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ وہ ایک تیز تلوار بن جاتی ہے جو باطل کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اس تلوار کو تیز کرنے کے لیے لا الٰہ الا اللہ کا پختہ یقین یا فقر یا عشق اس سے پہلے فساں کا کام دے چکا ہوتا ہے۔ خودی کا سرّ نہاں یہ ہے کہ وہ خدا سے محبت کرتی ہے اور خدا کے سوائے کسی اور محبوب کو قبول نہیں کرتی۔ خودی کی اصل حقیقت کیا ہے؟ لا الٰہ الا اللہ یعنی خدا اور صرف خدا کی محبت کا ایک جذبہ۔ خودی ایک تلوار ہے، جو لا الٰہ الا اللہ کی فساں پر تیز کی جاتی ہے۔

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الا اللہ　　خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ

تیغِ خودی کا کردار

جب خودی کی تلوار فقر کی سان پر تیز ہوتی ہے تو اس میں ایک زبردست قوت پیدا ہو جاتی ہے پھر ایک سپاہی کی ضرب بھی وہ کام کرتی ہے جو پوری فوج ہی سے بن آتا ہے۔

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پر تیغِ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ!

بعض لوگ لا الٰہ الا اللہ کو چند الفاظ سمجھتے ہیں لیکن خودی کے لیے اس کلمہ کی حیرت انگیز تاثیر کو دیکھ جائے تو پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کلمہ الفاظ کا ایک مجموعہ نہیں بلکہ ایک شمشیر برہنہ ہے جو باطل کا قلع قمع کر دیتی ہے۔

ایں دو حرف لا الٰہ گفتار نیست
لا الٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست

جب خودی کے اندر ایسا انقلاب پیدا ہو جائے تو پھر یہ بات کوئی تعجب انگیز نہیں ہوتی بلکہ معمولی نظر آتی ہے کہ خودی اپنی قوتِ عمل سے باطل کو نیست و نابود کر کے حق پرستوں کی ایک نئی دنیا وجود میں لے آئے

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا — عجب نہیں ہے کہ یہ چار سُو بدل جائے

جس انسان کے اندر خودی کا یہ انقلاب پیدا ہوتا ہے وہ خدا کا عبد (یعنی عبدہٗ) بن جاتا ہے۔ عبدہٗ کائنات کی تخلیق کا مخفی راز ہے کیونکہ کائنات اسی کو وجود میں لانے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ لا الٰہ اگر تیغِ بے زنہار ہے تو عبدہٗ اس تلوار کی دھار ہے۔ عبدہٗ حاصلِ کائنات اور حاصلِ تخلیق ہے "مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی" (جب تم نے اپنے ہاتھ سے ریت پھینکی تھی تو تم نے نہیں پھینکی تھی بلکہ خدا نے پھینکی تھی) کی آیت کریمہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدہٗ خدا کا ہاتھ بلکہ خود خدا بن جاتا ہے۔

لا الٰہ تیغ و دمِ اُو عبدہٗ — فاش تر خواہی بگو ہو عبدہٗ
عبدہٗ چند و چگونِ کائنات — عبدہٗ رازِ درونِ کائنات
مدّعا پیدا نہ گردد زیں دو بیت — تا نہ بینی از مقامِ مَا رَمَیْت

خودی کا یہ انقلاب مؤمن کو اپنی ترقی کے نقطۂ کمال پر اس لیے حاصل ہوتا ہے کہ وہ ماسوی اللہ کی محبت سے مکمل طور پر کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ خودی کا کمال خدا کی مخلصانہ محبت سے حاصل ہوتا ہے اور خدا کی مخلصانہ محبت خودی کے کمال سے۔ مؤمن کے یہ دونوں اوصاف درحقیقت ایک ہی وصف کے دو پہلو ہیں

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبتِ آشنا طلب — ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

دنیا کی ہر چیز سے کٹ جانا خدا کو پانے کی اور اپنے آپ کو پانے کی ابتدائی شرط ہے۔

تو ہم بذوقِ خودی رس کہ صاحبانِ طریق — بریدہ از ہمہ عالم بخویش پیوستند

مقامِ فقر

توحید کامل کے اسی مقام کو اقبال فقر کا نام دیتا ہے کیونکہ اس مقام پر مؤمن فقط خدا کی رضا کا طالب ہوتا ہے اور دنیا سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے۔ لیکن مؤمن کا فقر کافر کے فقر سے مختلف ہوتا ہے۔ کافر دنیا کو چھوڑ کر دشت و در میں خلوت گزیں ہو جاتا ہے اور پھر دنیا سے کوئی سروکار نہیں رکھتا، لیکن مؤمن دنیا کو

صرف ایک مقصود اور محبوب کی حیثیت سے ترک کرتا ہے اور اسے خدا کی محبت کی تکمیل یعنی اپنے اصل محبوب اور مقصود کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ایک ذریعہ کے طور پر کام میں لاتا ہے۔ پھر دنیا اس کی حاکم یا آقا نہیں رہتی، بلکہ محکوم یا غلام بن جاتی ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ اس کائنات کی ہر قسم کی مادی، سیاسی، اقتصادی، علمی، اخلاقی اور روحانی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ اپنے قبضۂ قدرت میں لائے تاکہ ان کی مدد سے محبوب کے مقاصد کو زیادہ سے زیادہ آسانی کے ساتھ پورا کر سکے۔ اس طرح سے مومن کے ترک کا نتیجہ تسخیر اور تعمیرِ کائنات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

کمالِ ترک نہیں آب و گِل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری ! !

مومن کے فقر کا اصل مقصد دنیا کو ترک کرنا نہیں بلکہ دنیا کو بزورِ بازو بدل کر درست کرنا ہوتا ہے، اسی لیے اقبال مومن کے فقر کو فقرِ غیور بھی کہتا ہے یعنی ایسا فقر جو باطل کو برداشت نہیں کرتا۔

لفظِ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے 'فقرِ غیور' !

ترکِ جہان کا ذکر کرنے والوں کو معلوم نہیں کہ اسلام میں ترکِ جہاں کا مطلب تسخیرِ جہاں ہے۔

اے کہ از ترکِ جہاں گوئی سخن
ترکِ ایں دیرِ کہن تسخیرِ او

بعض غیر مسلموں کا یہ کہنا قرآن پر اتہام ہے کہ وہ ترکِ جہاں کی تعلیم دیتا ہے۔ کیا قرآن کی اسی تعلیم نے مومن کو دنیا کا حکمران اور مہ و پروین کو مومن کا غلام نہیں بنا دیا تھا؟

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

قرآن کا فقر

بعض لوگ چنگ و رباب کی موسیقی یا جنگ اور شراب کی مستی یا رقص اور سرود کی لذت کو فقر سمجھتے ہیں لیکن قرآن کا فقر یہ نہیں۔ قرآن جس فقر کی تعلیم دیتا ہے وہ ہر چیز کا محاسبہ کرتا ہے تاکہ یہ دیکھے

کہ نیک کیا ہے اور بد کیا، زیبا کیا ہے اور زشت کیا ہے، حق کیا ہے اور باطل کیا ہے کونسی چیز رکھنے کے قابل ہے اور کونسی فنا کرنے کے لائق۔ مومن کے فقر کا نتیجہ کائنات کی قوتوں کی تسخیر ہے۔ اس کے ذریعہ سے مومن خدا کی صفات کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ کافر کا فقر یہ ہے کہ بدنی خواہشات کو ترک کر کے خدا کی جستجو کی جائے، مومن کا فقر یہ ہے کہ خودی کی تلوار کو لا الٰہ الا اللہ کی فساں پر تیز کیا جائے۔ وہ خودی کا مارنا اور سوختہ کرنا ہے اور یہ خودی کو چراغ کی طرح روشن کرنا ہے۔ جب فقر آشکار ہوتا ہے تو چاند اور سورج بھی اس کے خوف سے لرزہ براندام ہوتے ہیں۔ بدر و حنین کے معرکے اور میدانِ کربلا میں حسینؓ کی تکبیر فقرِ آشکار کے مظاہر ہیں۔ جب سے فقر آشکارائی کے ذوق سے عاری ہوا ہے مسلمان قوم کا وہ جلال باقی نہیں رہا۔

فقرِ قرآں احتسابِ ہست و بُود — نے رباب و مستی و رقص و سرود
فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات — بندہ از تاثیرِ اُو مولا صفات
آں خدا را جستن از ترکِ بدن — ایں خودی را بر فسانِ حق زدن
آں خودی را کشتن و داسوختن — ایں خودی را چوں چراغ افروختن
فقر چوں عریاں شود زیرِ سپہر — از نہیبِ اُو بلرزد ماہ و مہر
فقرِ عریاں گرمیِ بدر و حُنین — فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حُسینؓ
فقر را تا ذوقِ عریانی نماند — آں جلال اندر مسلمانی نہ ماند

فقر کے معجزات

جب صاحبِ فقر مومن اپنے محبوب کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے میدانِ عمل میں آنے کا عزم کرتا ہے تو چونکہ وہ خدا کی مرضی کے عین مطابق اور کائنات کے ارتقاء کی سمت میں اور قولِ کُن کی مخفی قوتوں کو آشکار کرنے کے لیے کام کرنا چاہتا ہے۔ اس کو خدا کے ایک مخفی انتظام سے، اس کی پراسرار حکمت سے اور اس کے کام کو آسان بنانے کے لیے اس کے مناسب حال کچھ غیر معمولی قوتیں دی جاتی ہیں، جن کے اصل سبب کو عام لوگ نہیں جانتے، کیونکہ وہ دراصل فقر کی کرامات یا فقر کے معجزات کے طور پر ہوتی ہیں۔ مثلاً کسی صاحبِ فقر مومن کو غیر معمولی علم دے دیا جاتا ہے کسی کو دن

کی حکمت سکھادی جاتی ہے، کسی کو غیر معمولی دانائی یا بصیرت عطا ہو جاتی ہے، کسی کو دلکش تقریر یا تحریر کا جوہر دے دیا جاتا ہے، کسی کو جاذبِ قلوب شعر کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے، کسی کو قیادت اور لیڈر شپ کی غیر معمولی اہلیت دے دی جاتی ہے، کسی کے لیے لوگوں کے دلوں میں کشش پیدا کر کے مرجع خلائق بنا دیا جاتا ہے، کسی کو سپہ سالار بنا دیا جاتا ہے، کسی کو سلطنت، کسی کو اختیار و اقتدار اور کسی کو بادشاہت اور تخت و تاج کے انعامات دے دیئے جاتے ہیں۔ اقبال اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
خودی ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

چونکہ فقر کے مقامات اور درجات ہزاروں ہیں، لہٰذا اس کے انعامات بھی ہزاروں ہیں۔

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی

تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ جس شخص کو ان نعمتوں میں سے کوئی مل جائے تو وہ اس کے مقامِ فقر کی دلیل یا علامت ہوگی۔ کیونکہ بعض وقت یہ نعمتیں ایسے انسانوں کو جو فقر کے مقام پر نہ ہوں، ان کی آزمائش کے لیے بھی دی جاتی ہیں تاکہ دیکھا جائے کہ نعمت پانے والا خدا کا شکر بجا لاتا ہے یا نہیں۔

صبغۃ اللہ

جب خدا کا عاشق خودی میں ڈوب کر ابھرتا ہے تو اس کی خودی خدا کی صفاتِ حسن کے رنگ میں رنگی جاتی ہے جس طرح سے ایک سفید کپڑا جب کسی رنگ میں ڈبویا جاتے تو اسی رنگ کو اختیار

کرلیتا ہے۔ پھر وہ خدا کے حسن سے ایک نیا حسن، خدا کے نور سے ایک نیا نور، خدا کے علم سے ایک نیا علم، خدا کی زندگی سے ایک نئی زندگی، اس کی قوت سے ایک نئی قوت اور اس کی محبت سے ایک نئی محبت لے کر آتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کی خودی خدا کی صفات کو جذب کر کے خدا کے اخلاق سے متخلّق ہو جاتی ہے اور وہ خدا کے جمال کا ایک عکس بن جاتا ہے۔ اس کے نیک و بد، زشت و زیبا، خوب و ناخوب اور محمود و نامحمود کے امتیاز کا معیار وہی ہو جاتا ہے جو خدا کا ہے۔ اس کا عدل وہ معمولی عام آدمیوں کا عدل نہیں رہتا جو ہمیشہ ان کی اپنی سفلی اغراض سے ملوّث اور ناقص تصوّرات کی ناپاک محبت سے آلودہ ہوتا ہے، بلکہ اس کا عدل وہ اعلیٰ درجہ کا خالص اور صحیح عدل ہوتا ہے جو صرف خدا کی محبت کے منبع سے صادر ہوتا ہے۔ اسی طرح سے اس کا صدق، اس کا کرم، اس کی حیا، اس کی عفت اور پاکیزگی، اس کا رحم اور اس کی تمام اخلاقی صفات چونکہ خدا کی کامل اور خالص محبت سے سرزد ہوتی ہیں، بلند ترین درجہ کی ہوتی ہیں۔

رنگِ اُو بر کن مثالِ اُو شوی
در جہاں عکسِ جمالِ اُو شوی

یہی خدا کا وہ رنگ ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں ہے کہ خدا کے رنگ سے بہتر رنگ کس کا ہے؟ اور یہ رنگ انسان کو خدا کی عبادت سے حاصل ہوتا ہے۔ (صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝ البقرۃ: ۱۳۸)

ہر اخلاقی قدر اتنی ہی قسموں یا درجوں کی ہوتی ہے جتنے انسانوں کے تصوّراتِ حسن یا نظریاتِ زندگی ہوتے ہیں۔ اگر کسی شخص کا تصوّرِ حسن پست ہوگا تو اس کا عدل یا صدق بھی اسی نسبت سے پست درجہ کا ہوگا۔ سچّا عدل یا سچّا صدق صرف خدا کی محبت سے پیدا ہوتا ہے اور ایک خدا شناس مومن ہی کا حصّہ ہوتا ہے۔ خودی پر خدا کا رنگ خدا کی گہری اور مخلصانہ عبادت اور محبت سے چڑھتا ہے۔ اس محبت کی وجہ سے خودی خدا کی صفات کے حسن کو جذب کرتی ہے اور ہوس کے بتوں کو توڑ کر تمام رذائل سے پاک اور تمام فضائل سے آراستہ ہو جاتی ہے۔

محکم از حق شو، سوئے خود گام زن
لات و عزّائے ہوس را سر شکن

خدا کی عبادت اور محبت سے انسان کی خودی خدا کی صفات کو کس طرح سے جذب کر لیتی ہے اور کس طرح سے متخلّق باخلاق اللہ ہو جاتی ہے ؟ اقبال ہمیں بتاتا ہے کہ جذب کرنا زندگی کا خاصّہ ہے۔ اگر زندگی حیاتیاتی سطح پر غذا سے اپنی ضرورت کے مادی ذرات کو جذب کر کے نشوونما پاتی ہے تو نفسیاتی یا نظریاتی سطح پر صفاتِ حسن کو جذب کر کے نشوونما پاتی ہے۔ حسن خودی سے وہی نسبت رکھتا ہے جو غذا جسم سے رکھتی ہے۔ جاوید نامہ میں جہاں دوست نے جو کام کی نو باتیں کہی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اس نے گلاب کے پھول سے پوچھا کہ تم باد و خاک سے یہ خوشنما رنگ اور یہ دلنواز خوشبو کیسے حاصل کرتے ہو؟ تو گلاب کے پھول نے جواب دیا کہ تم بجلی کی رو سے جو خاموش ہوتی ہے کسی کا پیغام کیسے سن لیتے ہو جس طرح تم برق سے پیغام حاصل کر لیتے ہو جس میں بظاہر کلام کا وصف نہیں، میں باد و خاک سے جن میں رنگ و بو نہیں رنگ و بو حاصل کر لیتا ہوں۔ دونوں کا انحصار زندگی کی اس خاصیت پر ہے کہ وہ اپنی فطرت سے مناسبت رکھنے والی چیزوں کو، جہاں سے مل جائیں، جذب کر لیتی ہے۔ اگر زندگی کے اندر یہ خاصیت نہ ہوتی تو وہ اپنے آپ کو قائم نہ رکھ سکتی۔ انسان کا جذب ظاہر ہے کیونکہ وہ حسن سے حسن کو جذب کرتا ہے لیکن میرا جذب ظاہر نہیں کیونکہ میں بظاہر غیر حسین سے حسن کو جذب کرتا ہوں۔

من بگُل گفتم بگو اے سینہ چاک! چوں بگیری رنگ و بُو از باد و خاک ؟
گفت گل اے ہوشمندِ رفتہ ہوش چوں پیامے گیری از برقِ خموش
جاں بتن مارا ز جذبِ این و آں جذبِ تو پیدا و جذبِ ما نہاں!

خودی غیر محدود اور غیر فانی ہے

چونکہ انسان کی خودی خدا کے ساتھ پیوست ہو کر خدا کی صفات سے حصہ لیتی ہے وہ اپنی بالقوہ صلاحیتوں کے اعتبار سے خدا کی طرح غیر محدود ہے۔ اگرچہ وہ ایک چھوٹی سی آب جُو نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجُو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں!

خودی اپنی ممکنات کے اعتبار سے محیطِ بیکراں اس لیے ہے کہ وہ ہمہ تن خدا کی آرزو ہے

اور خدا غیر محدود اور بیکراں ہے۔ چونکہ خدا غیر محدود ہے' ضروری ہے کہ غیر محدود ہونے کی آرزو خدا کی آرزو کے اندر موجود ہو۔ غیر محدود خدا کے لیے خودی کی آرزو اس بات کا ثبوت ہے کہ خودی کو غیر محدود ہونے کی آرزو بھی ہے۔ اقبال اس آرزو کی ترجمانی کرتا ہے۔

تُو ہے محیطِ بیکراں' میں ہوں ذرا سی آبجُو
یا مجھے ہمکنار کر' یا مجھے بے کنار کر!

اور پھر یہ آرزو ایسی ہے جو تشفی پانے کے لیے پیدا کی گئی ہے' کیونکہ اس کے تشفی پانے سے ہی کائنات اپنی تکمیل کے مرحلے طے کر سکتی ہے۔ یہ حقیقت اس بات کی ضمانت ہے کہ خودی بے کنار ہو کر رہتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خودی اپنی فطرت' اپنی ممکنات اور اپنی بالقوہ صلاحیتوں کی وجہ سے بے کنار ہے۔ ظاہر ہے کہ اُوپر کے شعر میں ہمکنار ہونے کی آرزو بھی درحقیقت بے کنار ہونے کی ہی آرزو ہے۔ پھر چونکہ خودی خدا کی صفات سے حصّہ لیتی ہے وہ اپنی ممکنات کے اعتبار سے غیر محدود ہی نہیں' بلکہ غیر فانی بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابدیت بھی خدا کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ زاہد کا یہ مقولہ کہ "خودی فانی ہے" اس بات کو نظر انداز کر جاتا ہے کہ خودی غیر محدود ہے' اگرچہ وہ بظاہر ایک حباب کی طرح محدود نظر آتی ہے' لیکن اس حباب میں ایک دریائے ناپیدا کنار چھپا ہوا ہے۔ اگر خودی اس بنا پر غیر محدود ہے کہ وہ خدا کی صفات سے حصّہ لیتی ہے تو اس بنا پر غیر فانی کیوں نہیں ہو سکتی۔ اگر زاہد ظاہر بین کو خودی کا غیر محدود ہونا سامنے نظر آ رہا ہے تو وہ اس سے یہ نتیجہ کیوں نہیں نکالتا کہ وہ غیر فانی بھی ہے۔

اے زاہدِ ظاہر بیں' گیرم کہ خودی فانی است
آیا تو نمے بینی دریا بحباب اندر!

دل کی شہادت

چونکہ اس مقام پر مومن خدا کی ذات کو بے پردہ دیکھ لیتا ہے اور اس کی آرزوئے حسن جو اسے بے قرار رکھتی تھی پوری طرح سے تشفی حاصل کر لیتی ہے' یعنی اتنی تشفی جتنی کہ اس کی خودی کی استعداد کے پیشِ نظر اس دنیا میں ممکن ہوتی ہے' لہٰذا وہ خدا کی ہستی کا جسے وہ پہلے اعتقادی طور پر اور بعد میں عملی طور پر مانتا تھا' اب ذاتی گواہ بن جاتا ہے اور اس کے دل کو ایک مکمل اور مستقل اطمینان نصیب ہوتا ہے،

کیونکہ اسے یقین ہوجاتا ہے کہ اس نے کائنات کا راز اور انسانی زندگی کا مدعا معلوم کرلیا ہے۔ اب خبر نہیں بلکہ نظر یعنی ذاتی مشاہدہ اس کے یقین و ایمان کا سامان بنتی ہے۔ اس حالت سے پہلے وہ "لا الٰہ الا اللہ" کہتا ہے تو عربی زبان کو جاننے کے باوجود اس طرح سے جیسے کوئی شخص کسی اجنبی زبان کے الفاظ کو مطلب سمجھنے کے بغیر دہرا رہا ہو لیکن قلب کی اس شہادت اور دل کی اس تصدیق کے بعد وہ لا الٰہ الاّ اللہ کے معنی کی تہ تک پہنچ جاتا ہے اور اصل بات یہ ہے کہ جب تک دل گواہی نہ دے کلمۂ توحید کا مطلب پوری طرح سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔

تو عرب ہو یا عجم ہو، ترا لَآ اِلٰـہَ اِلَّا !
لُغَتِ غریب، جب تک ترا دل نہ دے گواہی !

لیکن دل کی گواہی یا تصدیق کی نعمت انسان کو خدا کی محبت کی انتہائی منزل پر ہی نصیب ہوسکتی ہے۔ یہی دل کی گواہی یا تصدیق خودی کے زندہ ہونے کی شرط ہے۔

لا الٰہ گوئی بگو از روئے جان !
تا ز اندام تو آید بوئے جان !

عشق اور عمل سے خودی کا استحکام

اگر مومن کا نمایاں وصف علم ہو تو خودی کے انقلاب اور استحکام کے بعد اس کا علم کمال پر پہنچ جاتا ہے اور انسان اور کائنات کے اسرار و رموز اس پر اس طرح سے آشکار ہوتے ہیں کہ گویا جبریل بھی اس کے علم پر رشک کرنے لگتا ہے۔ اور اگر مومن کا نمایاں وصف عاشقانہ عمل ہو تو خودی کے انقلاب اور استحکام کے بعد اس کا عشق محرکِ عمل کی حیثیت سے کمال پر پہنچ جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عمل کی قوت سے ایک قیامت برپا کر دیتا ہے۔

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
خودی ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل !

اس حالتِ کمال کو پانے کے بعد جب وہ قرآن پڑھتا ہے تو اس کی آیات کے مطالب اور معانی کو اور طرح سے سمجھتا ہے کیونکہ پھر اسے ایسا نظر آتا ہے کہ یہ معانی اور مطالب خود اس کے

دل کے اندر پہلے ہی سے موجود تھے۔ ایسے ہی مومن کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ جب وہ اپنے آپ کو پالیتا ہے تو اسے ایک علم حاصل ہوتا ہے جس کی روشنی میں وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ قرآن کی آیات بیّنات پہلے ہی اس کے دل کے اندر موجود تھیں:

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (العنکبوت: ۴۹)

بلکہ قرآن ایسی آیاتِ بیّنات پر مشتمل ہے جو ان لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم دیا جاتا ہے پہلے ہی سے موجود ہیں

گویا وہ محسوس کرتا ہے کہ قرآن خود اس کے ضمیر پر نازل ہوا ہے۔ اور جب یہ صورتِ حال پیدا ہوتی ہے تو آیاتِ قرآنی کے معانی اور مطالب کی گرہیں اس پر کھلتی چلی جاتی ہیں۔ اور جب تک یہ صورتِ حال پیدا نہ ہو رازی اور صاحبِ کشاف بھی اس کے لیے یہ گرہیں کھول نہیں سکتے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشّاف

جب تک کہ وہ اس حالت کو نہیں پہنچتا یعنی ان معنوں میں خود صاحبِ قرآن نہیں بن جاتا، وہ بار بار قرآن کی تلاوت کرنے کے باوجود قرآن کے مطالب پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا وہ قرآن پڑھنے میں ہی لگا رہتا ہے اور قرآن پر عمل کر کے خدا کی دنیا کو بدلنے کا وقت اس پر نہیں آتا۔

نہیں کتاب سے ممکن تجھے فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں!

لیکن جب وہ اس حالتِ کمال کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے اپنے ضمیر کی روشنی دین کے اسرار و رموز اس پر منکشف کرتی ہے۔ اس کے بغیر وہ کسی اور طریق سے ان اسرار و رموز کو کبھی جان نہیں سکتا۔ جب تک وہ اس حالت کو نہ پہنچے وہ دین پر مجبوری سے عمل کرتا ہے، رغبت سے عمل نہیں کرتا۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کے احکام کی تعمیل مجبوری سے کرتا ہے وہ اس شخص کی نسبت خدا سے بہت دور ہے جو رغبت اور محبت سے ان کی تعمیل کرتا ہے۔

فاش مے خواہی اگر اسرارِ دیں
جز باعماقِ ضمیرِ خود مبیں!
گر نہ بینی دینِ تو مجبوری است
ایں چنیں دیں از خدا مہجوری است

گویا ایسی حالت میں مومن فقط قاری نہیں رہتا بلکہ خود قرآن بن جاتا ہے۔

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن!

علمِ عشق سے راہ نمائی پاتا ہے

پھر جب وہ انسانوں کے پیدا کیے ہوئے علوم پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے یہ معلوم کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی کہ کسی فلسفی یا حکیم، سائنسدان یا عالمِ دین، مفتی یا مجتہد، اور مفسر یا فقیہ کی کون سی بات درست ہے اور کون سی غلط۔ اس کا علم خود اس کو بتاتا ہے کہ ان لوگوں کے علم نے جو خدا کی محبت کے کمال سے محروم ہیں جو غلط حقائق کے بت کھڑے کر لیے ہیں ان کو کس طرح سے توڑا جا سکتا ہے اور ان کی جگہ صحیح حقائق کو کس طرح سے رکھا جا سکتا ہے۔

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم

عالمِ دین یا فقیہ منطق کی نازک خیالیوں یا لغت کی موشگافیوں سے انہی علمی مشکلات کو حل کرنا چاہتا ہے اور پھر بھی حل نہیں کر سکتا۔ لیکن ایسا مومن کلمۂ توحید کے نورِ تجسس کی مدد سے ہر علمی حقیقت کو آسانی دیکھ لیتا ہے کیونکہ وہ اس کے دل میں پہلے ہی موجود ہوتی ہے اور اسے دیکھنے کے لیے اسے فقط اپنے دل میں جھانکنا پڑتا ہے اور اسے منطق اور لغت کے بکھیڑوں میں الجھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

قلندر جز دو حرفِ لَا اِلٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

خودی کے اسی مقام کو اقبال 'تجلی' (یعنی خدا کے نور کا چمکنا) کہتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ 'تجلی' کے بغیر انسان بے یقینی اور بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے اپنے شکوک و شبہات ہی اس کی روحانی موت کا موجب بن جاتے ہیں۔ گویا مقامِ تجلی انسان کے شکوک و شبہات کو دور کر کے اس کے یقین کو محکم کرتا ہے اور اس کی عقل اور اس کے دین کی صحیح راہ نمائی کرتا ہے۔ تجلی کے بعد انسان کی عقل اسے خدا کے اور قریب لاتی ہے، اس سے دور نہیں کرتی اور وہ احکامِ دین کی پابندی کسی

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

سورۃ البقرہ (۲۲)

(آیات ۳۱، ۳۲)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیرِ مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحث اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیرِ مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیرِ بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲ : ۵ : ۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲ : ۵ : ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲ : ۲۲ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۳۱ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝۳۲

۲ : ۲۲ : ۱ اللغۃ

۲ : ۲۲ : ۱ (۱) [وَعَلَّمَ] "وَ" (اور) ۔ عَلَّمَ کا مادہ ع ل م اور وزن "فَعَّلَ"

ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد (علِم یعلَم = جان لینا) کے معنی و استعمال وغیرہ پر بات ہو چکی ہے [البقرہ : ۱۳ یعنی ۲ : ۱۰ : ۱ (۳)]

لفظ " عَلَّمَ " اس مادہ (علم) سے باب تفعیل کے فعل ماضی معروف کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ اس باب سے فعل " علّم ..... یُعَلِّمُ تَعْلِیمًا " کے معنی ہیں : "..... کو سکھانا، سکھلانا، بتا دینا، تعلیم دینا، ..... کو ..... کا علم دینا۔" باب تفعیل کی خاصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے راغب نے (مفردات) میں تعلیم کے معنی کثرت اور تکرار کے ساتھ پڑھانا سکھانا تاکہ بات (سبق) سیکھنے والے کے ذہن نشین ہو جائے " بتائے ہیں۔ اس فعل کے عموماً دو مفعول ہوتے ہیں جسے سکھایا جائے اور جو چیز سکھائی جائے۔ دونوں مفعول بنفسہٖ (صلہ کے بغیر) آتے ہیں جیسے "عَلَّمَهُ الكِتابَةَ " (اس نے اسے لکھنا سکھایا) البتہ (۱) بعض دفعہ مفعول اول محذوف کر دیا جاتا ہے جیسے " عَلَّمَ الْقُرْآنَ (الرحمٰن : ۲) — اور (۲) کبھی مفعول ثانی حذف کر دیا جاتا ہے جو سیاقِ عبارت سے سمجھا جاتا ہے جیسے " ويُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ (البقرہ : ۲۸۲) (۳) کبھی دونوں مفعول محذوف ہوتے ہیں جیسے "عَلَّمَ بِالْقَلَمِ " (العلق : ۴) (۴) اور بعض دفعہ مفعول ثانی سے پہلے باء (بِ) کا صلہ بھی استعمال ہوتا ہے، اس صورت میں اس کا ترجمہ "جتلانا" سے کرنا زیادہ موزوں ہوتا ہے جیسے " أَتُعَلِّمُونَ اللّٰهَ بِدِينِكُمْ" (الحجرات: ۱۶) میں ہے۔ ان تمام مواقعِ استعمال پر حسبِ موقع بات ہو گی۔ انشاء اللہ۔

اس باب تفعیل (تعلیم) سے افعال کے مختلف صیغے چالیس سے زائد جگہ اور اسم مشتق (مفعول) کا صرف ایک صیغہ " مُعَلَّمٌ " ایک ہی جگہ (الدخان : ۱۴) قرآن کریم میں وارد ہوئے ہیں۔

۲ : ۲۲ : ۱ (۲) [اٰدَمَ] بعض اہل لغت (مثلاً راغب) کے نزدیک " آدم " کا مادہ " ادم " اور وزن " أَفْعَلُ " (غیر منصرف) ہے۔ اس کی اصلی شکل " أَأْدَمُ " تھی۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد مختلف ابواب سے مختلف معنی کے

لیے آتا ہے ۔مثلاً ادَم یأدِم اَدمًا (باب ضرب سے) کے معنی ہیں (۱) صلح صفائی کرانا (۲) (جانور کی) کھال کو صاف کرنا (۳) روٹی کو شوربے میں ڈالنا ۔اور اسی سے عربی میں سالن کو "اِدامٌ" کہتے ہیں ___ اور ادِم یأدم اُدمَۃً (باب سمع سے) کے معنی ہوتے ہیں "رنگ میں "سمرہ" ہونا یعنی سرخ یا گندمی رنگ کا ہونا" عام عربی زبان میں یہ مادہ مزید فیہ کے بعض ابواب سے بھی مختلف معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے ___ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے کسی قسم کے فعل کا کوئی صیغہ کہیں وارد نہیں ہوا ۔

● "اَدِم" (باب سمع سے) کے معنی سے آدمُ بروزن "اَفْعَلُ" ۔ گہرے گندمی یا بھورے رنگ والے کو کہتے ہیں ۔اس کی مؤنث "اَدماءُ" اور جمع (ہردو کے لیے) "اُدْمٌ" بروزن "فُعْلٌ" ہے (کیونکہ یہ افعل الوان وعیوب والا وزن ہے) ۔گویا "آدم" دراصل اسم صفت ہے اور آدم کے نام کو اس کی جلد کے (عمومی) رنگ سے مناسبت ہے ۔

بعض اہل علم کے نزدیک "آدم" غیر عربی لفظ ہے ۔اور اس کے غیر منصرف ہونے کی وجہ عجمیت (عجمی ہونا) اور عَلمیت (نام ہونا) کا اکٹھا ہونا ہے ۔

گویا ایک عربی مادے سے اس کی مناسبت محض اتفاق ہے ۔اس قسم کے کئی اور عجمی الفاظ بھی چل کر ہمارے سامنے آئیں گے ۔

● بہر حال دونوں صورتوں میں "آدم" سے مراد عموماً "انسانِ اوّل" یا "ابوالبشر" لیا جاتا ہے ۔اور اسی سے آدمیوں کے لیے قرآن کریم میں لفظ "بنی آدم" (آدم کی اولاد) استعمال ہوا ہے ۔قرآن کریم میں لفظ "آدم" سترہ جگہ اور "بنی آدم" آٹھ دفعہ آیا ہے ۔اور اس کے جملہ مواقع استعمال کو سامنے رکھتے ہوئے اسی "انسانِ اوّل" یعنی "ابوالبشر" (سب بشر کا باپ) والے معنی کی تائید ہوتی ہے ۔

<u>۲:۲۲:۱ (۳)</u> [اَلْاَسْمَآءَ] کا مادہ "س م و" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "اَفْعَالٌ" ہے ۔اس کی اصلی شکل "اسماوٌ" تھی مگر الف ممدودہ کے بعد آنے

والی "و" (یا "ی") کو عرب ہمزہ میں بدل کر بولتے اور لکھتے ہیں۔ "اسماءٌ" جمع مکسر ہے اور اس کا مفرد (واحد) "اِسمٌ" ہے جس کا اردو فارسی ترجمہ "نام" ہے۔ اس مادہ (س م و) سے فعل مجرد کے باب اور معنی کے علاوہ لفظ "اسم" کی مکمل لغوی وضاحت "بسم اللہ" کی بحث میں کی جا چکی ہے۔

۱:۱:۱:(۱) میں۔

[كُلَّهَا] جو "كُلٌّ" (بمعنی سب، تمام) + هَا (ضمیر مجرور مؤنث بمعنی اس کا/ان کا) کا مرکب ہے۔ اس ترکیب اضافی کا لفظی ترجمہ ہے "اس کے سب" جس کا بامحاورہ ترجمہ "وہ سب کے سب، کل کے کل، سارے کے سارے" ہے۔ لفظ "كلٌّ" کے مادہ اور اس کے استعمال کے ضروری قواعد البقرہ: ۲۰ یعنی ۲:۱۵:۱:(۹) میں بیان ہو چکے ہیں۔

[ثُمَّ] کا اردو ترجمہ "پھر، اس کے بعد" ہے۔ اس کلمہ کے مادہ، معنی اور استعمال کے بارے میں البقرہ: ۲۸ یعنی ۲:۲۰:۱:(۴) میں بات ہو چکی ہے۔

۲:۲۲:۱:(۴) [عَرَضَهُمْ] یہ فعل "عَرَضَ" اور ضمیر منصوب "هم" (بمعنی "ان کو") کا مجموعہ ہے۔ "عَرَضَ" کا مادہ "ع ر ض" اور وزن "فَعَلَ" ہے۔ یعنی یہ اس ثلاثی مادہ سے فعل مجرد کا فعل ماضی کا پہلا صیغہ (واحد مذکر غائب) ہے۔ یہ فعل مجرد عَرَضَ ..... یعرِضُ عَرْضًا (زیادہ تر باب ضرب سے) مختلف اور متعدد معنی کے لیے ـــ لازم متعدی دونوں طرح ـــ استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بنیادی معنی (بصورت لازم) "سامنے ظاہر ہونا، پیش آنا" ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں عَرَضَ الشَّيْءُ (چیز ظاہر ہوئی۔ سامنے آئی) اور بصورت متعدی اس کے معنی "حاضر یا ظاہر کرنا، ..... کے سامنے پیش کرنا" ہوتے ہیں۔ جو چیز پیش کی جائے وہ بطور مفعول بنفسہ مذکور ہوتی ہے اور جس کے سامنے پیش کی جائے اس کا ذکر "علی" کے صلہ کے ساتھ آتا ہے۔ مثلاً کہیں گے "عَرَضَ الشَّيْءَ علی فلان" (اس نے چیز کو فلاں کے سامنے پیش کیا)۔

● اسی باب (ضرب) سے یہ فعل بعض دیگر معانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور باب نصر، سمع اور کرم میں بھی یہ متعدد مختلف معانی دیتا ہے جس کی تفصیل کسی اچھی معجم (ڈکشنری) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

تاہم قرآن کریم میں یہ فعل مجرد نہ تو "ضرب" کے علاوہ کسی دوسرے باب سے آیا ہے اور نہ ہی مذکورہ بالا معنی کے علاوہ کسی اور معنی میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے ماضی اور مضارع (معروف ومجہول) کے مختلف صیغے کل بارہ (۱۲) جگہ آئے ہیں اور ہر جگہ صرف بنیادی معنی یعنی "پیش کرنا، سامنے رکھنا یا کرنا یا لانا، حاضر کرنا" (متعدی) کے لیے ہی آیا ہے۔ یہاں زیر مطالعہ لفظ میں اسی لیے اردو مترجمین نے "سامنے کیا، روبرو کردیا، پیش کیا، سامنے رکھا" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ ایک آدھ مترجم نے "دکھائے" بھی ترجمہ کیا ہے جسے بلحاظ مفہوم ہی درست کہا جاسکتا ہے۔

ثلاثی مجرد کے علاوہ اس مادہ سے مزید فیہ کے بعض ابواب (تفعیل اور افعال) سے فعل کے مختلف صیغے اور متعدد جامد اور مشتق اسماء ــــ قرآن کریم میں ستر کے قریب مقامات پر آئے ہیں۔ ان سب کا بیان اپنے موقع پر آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

[عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ] یہاں "علی" فعل "عرض" کے صلہ کے طور پر آیا ہے (اوپر دیکھئے "عرضھم" میں عرض کے استعمال کا طریقہ) اور یہاں یہ (علی) "پر" یا "کے سامنے" کے معنی میں ہے۔ (یعنی فرشتوں کے سامنے کیا)۔ لفظ "الملائکۃ" (بمعنی فرشتے یا فرشتوں) کے مادہ وغیرہ کی لغوی بحث ابھی اوپر البقرہ : ۳۰ یعنی ۲ : ۲۱ : ۱ (۲) میں گزر چکی ہے۔

[فَقَالَ] "پس اس نے کہا"۔ غالباً اب آپ کو ان کے معنی وغیرہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ فائے عاطفہ اور فعل "قال" کئی دفعہ آچکے ہیں۔

بہر حال اگر چاہیں تو " فَ " کے لیے البقرہ : ۲۲ یعنی ۲ : ۱۶ : ۱ (۱۰) اور "قال" کے مادہ ، باب معنی اور تعلیل وغیرہ کے بارے میں البقرہ : ۳۰ یعنی ۲ : ۲۱ : ۱ (۱) کے بعد دیکھ لیجئے۔ فعل " قال یقول " کی لغوی بحث سب سے پہلے البقرہ : ۸ یعنی ۲ : ۷ : ۱ (۵) میں ہوئی تھی۔

۲ : ۲۲ : ۱ (۵) [اَنْبِئُوْنِیْ] کا مادہ " ن ب أ " اور موجودہ وزن " اَفْعِلُوْنِیْ " ہے ۔ اس میں آخری " نی " تو یائے متکلم یعنی ضمیر منصوب " ی " ہے جس سے پہلے والا " ن " نونِ وقایہ ہے ۔ اس طرح اس " نِی " کا ترجمہ تو ہو گا " مجھ کو یا مجھے " ۔ باقی فعل " انبئُوا " بر وزن " اَفْعِلُوا " ہے ۔

اس ثلاثی مادہ سے فعل مجرد " نبأَ ینبأُ " (باب فتح سے) مختلف مصدروں (نَبْأً ، نُبُوْءًا اور نَبْأَۃً) کے ساتھ ۔۔۔ اور صلہ کے بغیر اور " عن " اور " علی " کے صلوں کے ساتھ بھی ۔۔۔۔ لازم متعدی مختلف معنوں کے لیے آتا ہے ۔ مثلاً " بلند ہونا ، ہلکی آواز نکالنا ، ...... پر غالب آنا ، ...... سے دور ہو جانا " وغیرہ ۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے فعل مجرد کا کسی معنی میں بھی کوئی صیغۂ فعل کہیں استعمال نہیں ہوا ۔ البتہ مزید فیہ کے ابواب تفعیل ، اِفعال اور استفعال سے مختلف صیغے پچاس کے قریب ۔۔۔ اور مختلف جامد و مشتق کلمات سو سے زائد ۔۔۔ مقامات پر وارد ہوئے ہیں ۔

● زیر مطالعہ کلمہ " انبئُونی " اس مادہ (نبأَ) سے باب اِفعال کے فعل امر معروف کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے ۔ اس باب (اِفعال) سے فعل " اَنبأَ ..... یُنْبِئُ اِنباءً " کے معنی ہیں : " ..... کو خبر دینا ، ..... کو بتلانا " ۔۔۔ اور اس کے لیے دو مفعول درکار ہوتے ہیں ۔ جس کو خبر دی جائے اور جس چیز کی خبر دی جائے ۔ عموماً دونوں مفعول بنفسہٖ (بغیر صلہ کے) آتے ہیں اور بعض دفعہ دوسرے مفعول سے پہلے " باء " (بِ) کا صلہ بھی آتا ہے مثلاً کہیں گے " اَنْبَأَہٗ الخبرَ " یا اَنْبَأَہٗ بِالخبرِ " (اس کو خبر بتلائی) ۔۔۔۔ قرآن مجید میں اس

مادہ سے بابِ اِفعال کے صیغے کل چار جگہ آئے ہیں ۔ دو جگہ فعل ماضی اور دو جگہ فعل امر کی صورت میں ۔ جن میں سے ایک یہ (زیر مطالعہ) ہے ۔ اس طرح اس کا ترجمہ بنتا ہے "تم بتاؤ، یا خبر دو" ـــــ یہ صرف صیغۂ امر (انبئوا) کا ترجمہ ہے۔ "نی" کا ترجمہ پہلے ہو چکا ہے ۔

[بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ] یہ بِ + اسماء + هٰؤلاء کا مرکب ہے ۔ اس میں باء (بِ) تو اس فعل (انبأ) کا وہ صلہ ہے جو مفعول ثانی (جو یہاں "اسماء" ہے) پر لگتا ہے اور جس کا قاعدہ ابھی اوپر "انبئونی" میں بیان ہوا ہے ۔ اگر فعل "اَنبأ" کا ترجمہ "خبر دینا یا آگاہ کرنا" سے کیا جائے تو یہاں اس "بِ" کا ترجمہ ..... کی (خبر دو) یا .... سے (آگاہ کرو) ہوگا ۔ اور اگر اس فعل کا ترجمہ "بتلانا یا بتانا" سے کیا جائے تو اردو محاورہ میں اس (بِ) کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ صرف "بتلاؤ تو" یا "بتاؤ تو" سے کام چل جائے گا ۔ لفظ "اسماء" (ناموں) کی لغوی وضاحت ابھی اوپر اسی زیر مطالعہ آیت میں ہو چکی ہے ۔ اور "هٰؤلاء" اسم اشارہ قریب جمع (برائے مذکر و مؤنث) ہے جس کا ترجمہ یہاں "یہ سب" یا "ان سب" یا صرف "ان کے" کے ساتھ ہوگا ۔ اسماءِ اشارہ کے بارے میں کچھ اصولی باتیں البقرہ: ۲ یعنی ۲ : ۱ : ۱ (۱) میں بیان ہوئی تھیں ۔

[اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ] یہ پورا جملہ اس سے پہلے البقرہ: ۲۳ یعنی ۲ : ۱۷ : ۱ (۱۰) میں گزر چکا ہے ۔ اور اس کے تینوں اجزاء (یعنی "اِنْ"، کنتم اور صادقین) کی مکمل لغوی وضاحت بھی وہاں ہو چکی ہے ۔ ضرورت ہو تو "اِنْ" کے معانی و استعمال کے لیے ۲ : ۱۷ : ۱ (۱) اور "کنتم" کی ساخت وغیرہ کے لیے یہی یعنی ۲ : ۱۷ : ۱ (۱) کے ساتھ ہی بعد میں اور "صادقین" کی لغوی وضاحت کے لیے ۲ : ۱۷ : ۱ (۱۰) میں دیکھئے ۔

۲ : ۲۲ : ۱ (۶) [قَالُوْا سُبْحٰنَكَ] قالوا (جس کا مادہ "ق و ل" اور

وزن اصلی " فَعَلُوْا " ہے، کے مادہ ، باب وغیرہ پر البقرہ : ۸ یعنی ۲ : ۷ : ۱ (۵) میں اور خود اسی لفظ (قالوا) کی بناوٹ کے بارے میں البقرہ: ۱۱ یعنی ۲ : ۹ : ۱ (۴) کے ساتھ ہی بات ہو چکی ہے۔

" سُبْحٰنَكَ " دراصل دو لفظوں " سبحان " اور " كَ " (ضمیر مجرور بمعنی تیری / تیرا) سے مرکب ہے، اس میں کلمہ " سُبْحَان " (یہ اس کی رسم املائی ہے، رسم عثمانی پر آگے بات ہوگی) کا مادہ " س ب ح " اور وزن " فُعْلَانٌ " ہے۔ (یہاں "سبحانَ" کے آخری " ن " کی فتحہ (ـَ) کی وجہ ابھی آگے " الاعراب " میں بیان ہوگی)۔
اس مادہ سے فعل مجرد وغیرہ کی بحث ابھی گزشتہ آیت (البقرہ : ۳۰) یعنی ۲ : ۲۱ : ۱ (۷) میں لفظ " نُسَبِّحُ " کے ضمن میں گزر چکی ہے۔
یہ کلمہ (سبحان) اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد " سَبَحَ (الرجلُ) يَسْبَحُ سبحانًا " (باب فتح سے) کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں " (آدمی) کا " سبحان اللہ " کہنا " یعنی " اللہ کی پاکیزگی بیان کرنا " یعنی یہ اسی مادہ سے باب تفعیل کے مصدر "تسبیح" کا ہم معنی ہے جس پر ۲ : ۲۱ : ۱ (۷) میں بات ہوئی تھی۔ اس طرح کلمہ " سبحانَكَ " لفظی ترجمہ تو بنتا ہے : " تیری پاکیزگی بیان کرنا " مگر اردو محاورے میں اس کا ترجمہ " پاکی ہے تجھے " یا " تو پاک (ذات) ہے " سے کیا جاتا ہے۔ اس ترجمہ کی اعرابی توجیہ اور بامحاورہ ترجمہ کی نحوی بنیاد پر مزید بات ابھی آگے بحث " الاعراب " میں ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

[لَاعِلْمَ لَنَا] یہ لَا + علم + لَ (جو دراصل لام الجر " لِ " ہے مگر ضمیروں کے ساتھ فتحہ (ـَ) کے ساتھ پڑھا جاتا ہے) + نَا (ضمیر مجرور بمعنی " ہمارا ") کا مرکب ہے۔

" لَا " یہاں نفی جنس کا ہے [دیکھئے ۲ : ۱ : ۱ (۳) میں] جس کا ترجمہ " کسی قسم کا " ، " کوئی بھی " سے ہوگا۔ لفظ " عِلْم " کے مادہ (ع ل م) اور باب فعل وغیرہ (عَلِمَ يَعْلَمُ : جاننا) پر البقرہ : ۱۳ یعنی ۲ : ۱۰ : ۱ (۳) میں بات ہو چکی ہے۔

بنیادی طور پر یہ لفظ (علم) اس فعل کا مصدر ہے اور اس کے معنی "جاننا" ہیں مگر یہ اسم مفعول کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی "معلوم یا جانی ہوئی چیز" یا "معلومات"۔ اور خود یہ لفظ (علم) بھی اردو میں عام مستعمل ہے اس لیے "لاعلم" کا ترجمہ "کچھ بھی علم نہیں" یا "کچھ بھی معلوم نہیں" ہوگا۔ اور "لَنَا" کے لفظی ترجمہ "ہمارے لیے" کی بجائے اردو محاورے کے لحاظ سے "ہم کو" زیادہ موزوں ہے۔ اس طرح "لاعلم لنا" کا ترجمہ ہوا "ہم کو کچھ بھی معلوم نہیں"۔ اسی کو مزید بامحاورہ کرتے ہوئے بعض نے "ہم تو کچھ بھی نہیں جانتے" ترجمہ کیا ہے۔

[اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا] یہ تین کلمات ہیں "اِلَّا"، "مَا" اور "عَلَّمْتَنَا"۔ ان میں سے پہلا یعنی "اِلَّا" حرفِ استثناء ہے جس کا اردو ترجمہ "مگر"، "سوائے"، "کے سوا" ہے۔ اس (اِلَّا) کے استعمال پر البقرہ : ۹ یعنی ۲ : ۸ : ۱ (۳) بات ہو چکی ہے۔ دوسرا کلمہ "مَا" یہاں موصولہ ہے جس کا ترجمہ "جو کچھ کہ یا صرف جو کہ" ہوگا۔ اس (مَا) کے معنی و استعمال کی البقرہ : ۳ یعنی ۲ : ۲ : ۱ (۵) وضاحت ہو چکی ہے تیسرا لفظ "عَلَّمْتَنَا" ہے جو "عَلَّمْتَ + نا (بمعنی ہم کو)" کا مرکب ہے۔ اس میں فعل "عَلَّمْتَ" کا مادہ "ع ل م" اور وزن "فَعَّلْتَ" ہے (اس مادہ سے فعل مجرد پر البقرہ : ۱۳ یعنی ۲ : ۱۰ : ۱ (۳) میں بات ہو چکی ہے) "عَلَّمْتَ" اس مادہ سے باب تفعیل کا فعل ماضی معروف صیغہ واحد مذکر حاضر ہے اور اس باب سے فعل "علّم یعلّم تعلیمًا" کے معنی (سکھانا، پڑھانا، تعلیم دینا، علم دینا) پر بھی ابھی اوپر البقرہ : ۳۱ ـــ ۲ : ۲۲ : ۱ (۱) میں بحث ہو چکی ہے۔

اس طرح "الا مَا عَلَّمْتَنَا" کا لفظی ترجمہ ہے: "مگر وہ جو کچھ کہ تو نے سکھایا ہم کو"۔

[اِنَّكَ اَنْتَ] یہ "اِنَّ" (بے شک، یقیناً) + "كَ" (ضمیر منصوب بمعنی "تُو") + "اَنْتَ" (ضمیر مرفوع بمعنی "تُو") کا مرکب ہے۔ "تُو" کے دو دفعہ آنے کی وجہ سے (یا یوں کہیئے کہ ضمیر فاصل "انت" کی وجہ سے)

"اِنَّكَ اَنْتَ" کا ترجمہ "بے شک تو ہی ہے" سے کیا جائے گا۔

۲:۲۲:۱(۷) [الْعَلِيْمُ] کا مادہ "ع ل م" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "فَعِيْلٌ" ہے۔ جو فعل ثلاثی مجرد "علِم یعلَم علِماً (دیکھئے ۲:۱۰:۱(۳)) سے صفت مشبہ کا وزن ہے اس کا ترجمہ "بہت جاننے والا، ہر وقت اور سب کچھ جاننے والا" ہونا چاہئے مگر مختصراً "بڑا جاننے والا" ہی کر لیا جاتا ہے اور اسی لیے بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ "اصل دانا"، "اصل جاننے والا"، "بڑے علم والا" اور "بڑا علم والا" کے ساتھ کیا ہے۔

۲:۲۲:۱(۸) [الْحَكِيْمُ] کا مادہ "ح ک م" اور وزن لام تعریف کے بغیر "فعیل" ہے۔ اس ثلاثی مادہ سے فعل مجرد "حکم یحکُم حُکماً (عموماً باب نصر سے) سے آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی "فیصلہ کرنا، حکم دینا یا چلانا" ہوتے ہیں۔ اور اسی باب نصر سے یہ بطور فعل متعدی بھی استعمال ہوتا جس کے معنی: "...... کو منع کرنا"، "...... کو روک دینا" ہوتے ہیں مثلاً کہتے ہیں "حکَمَهٗ، یحکُمه" (اس نے اسے منع کیا)۔ اور "حکُمَ یحکُمُ حکماً" (باب کرم سے) بھی آتا ہے۔ اور اس کے معنی ہیں: "دانائی اور حکمت والا ہونا" ____ قرآن کریم میں اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد (باب نصر سے) کے مختلف صیغے ۴۵ سے زیادہ جگہ آئے ہیں۔ اس کے علاوہ مزید فیہ کے بعض ابواب (افعال، تفعیل اور تفاعل) سے چند صیغے اور اسی مادہ سے ماخوذ و مشتق کلمات (مثل حُکم، حکمة، حکام وغیرہ) ڈیڑھ سو سے زیادہ مقامات پر وارد ہوئے ہیں۔

● لفظ "الحکیم" اس مادہ (ح ک م) کے فعل مجرد (باب کرُم) سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے اس لیے اس کا ترجمہ "بہت بڑا دانا"، "بڑی دانائی والا"، "ہر وقت اور ہمیشہ دانا" ہو سکتا ہے۔ عربی کا لفظ "حِکْمة" اردو میں (حکمت کی املاء کے ساتھ) مستعمل ہے اور اس کے معنی میں فارسی کے لفظ "دانائی" کی نسبت وسعت بھی زیادہ ہے۔ اسی لیے اکثر اردو مترجمین نے اس کا ترجمہ "حکمت والا"،

"بڑا حکمت والا" سے کیا ہے ـــــ اور اگر اسے "حکَم یحکُم (باب نصر) سے "فعیل" سمجھیں تو اس کے معنی "بڑا حکم دینے والا، بڑا حاکم" بھی ہو سکتے ہیں۔

اور بعض نے یہاں اسے فَعِیل بمعنی "مُفْعِلٌ" لیا ہے یعنی اس مادہ سے باب اِفعال "اَحکَم یُحکِم اِحکامًا" (بمعنی "کسی چیز کو مضبوط کرنا"، "پختگی سے کرنا"، "عمدہ طریقے پر بنانا") ـــــ سے اسم الفاعل کے معنی میں لیا ہے۔ اور شاید اسی لیے بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ "پختہ کار" کیا ہے۔

۲:۲۲:۲ الإعراب

زیر مطالعہ دو آیات میں سے ہر ایک آیت ایک لمبا جملہ ہے۔ ویسے پہلی آیت (ع ۳۱) دراصل تین مکمل اعرابی جملوں پر مشتمل ہے جو حروف عاطفہ (ثم اور فاء) کے ذریعے باہم مربوط ہیں۔ دوسری آیت (ع ۳۲) بھی دراصل تو تین چھوٹے جملوں پر مشتمل ہے مگر تمام جملے "قالوا" کے مقول ہونے کی بناء پر ایک ہی مربوط جملہ شمار ہو سکتا ہے۔ اعراب کی تفصیل یوں ہے:

(۱) وعلم آدم الاسماء کلها ثم عرضهم علی الملئکة فقال انبئونی باسماء هولاء ان کنتم صدقین۔ اس آیت کو تین جملوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ع ۱ **پہلا جملہ** "وعلم آدم الاسماء کلها" ہے۔

اس جملے کی ابتدائی واو [وَ] یہاں مستانفہ ہے کیونکہ واو العطف سمجھ کر اس جملے کو اس سے پہلے (سابقہ) جملے کے آخری حصے کے ساتھ ملانے سے عبارت بنتی ہے "اعلم مالا تعلمون ـــــ وعلّم آدم" (میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور اس نے سکھایا آدم کو) کا بلحاظ مضمون کوئی تک نہیں بنتا۔ لہٰذا یہ واو استیناف (ایک نئے جملہ کے شروع ہونے) کے لیے ہی ہو سکتی ہے۔

● البتہ چونکہ واقعہ وہی (آدمؑ کا) بیان ہو رہا ہے اور یہ عبارت (عَلَّمَ آدمَ) بھی اسی قصے کا ایک حصہ ہے۔ اس لیے بعض نحوی حضرات یہاں اس " وَ " کے بعد والے جملے (عَلَّمَ آدم ....) کو اس " واو " کے ذریعے ایک مقدر (UNDERSTOOD) عبارت پر عطف سمجھتے ہیں جسے پڑھنے والے کا ذہن سمجھ سکتا ہے گویا سابقہ آیت (۲:۳۰ جس میں خلیفہ بنانے کا ذکر آیا ہے) کے بعد کچھ اس طرح کی عبارت مقدر ہے " فجعل فی الارض خلیفۃ سماہ آدم " پس اس نے زمین میں ایک نائب بنایا جس کا نام آدم رکھا) پھر اس آدم کے بارے میں اگلی بات " وعلّم آدم ..... " شروع ہوتی ہے ــــ قصہ گوئی کے ادبی انداز بیان میں ــــ بلکہ بعض دفعہ عام گفتگو میں بھی ــــ ایسی محذوف یا مقدر عبارتوں کا رواج عام ہے جس سے پیدا ہونے والے خلاء ( ) کو قاری یا سامع کا ذہن خود پر کر لیتا ہے۔ اس قسم کے محذوف کلمات اور مقدر عبارات قرآن کریم میں بکثرت سامنے آئیں گی۔ یہ کلام کا عیب نہیں بلکہ خوبی ہے جس سے تھوڑے لفظوں میں زیادہ بات سمجھا دی جاتی ہے۔

بہر حال اردو ترجمہ واو مستانفہ کا بھی " اور " سے کیا جاتا ہے [دیکھئے ۲:۷:۱(۱)]۔ [عَلَّمَ] فعل ماضی معروف مع ضمیر الفاعل "ھو" ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ [آدم] اس فعل (عَلَّم) کا مفعول بہ اول (لہذا منصوب ہے علامت نصب "م" کی فتحہ (ـَ) ہے اس لیے کہ " آدم " غیر منصرف ہے اور [الاسماء] فعل "علّم" کا مفعول بہ ثانی ہے جس میں علامت نصب آخری ھمزہ کی فتحہ (ـَ) ہے۔ (یہ فتحہ لام تعریف کی وجہ سے تنوین کی بجائے رہ گئی ہے) [كُلَّهَا] میں لفظ "کُلَّ" تاکید کے لیے ہے[1] اس لیے منصوب ہے۔

[1] توکید یا تاکید چار مشہور توابع (صفت، بدل، تاکید اور معطوف) میں سے ایک ہے جو عموماً " کُلّ، نفسُ، جمیعٌ، عَیْنٌ، کِلاَ.... اور کِلتا..... " کے ذریعے ظاہر کی جاتی ہے اور کلمہ تاکید کا اعراب ہمیشہ اپنے مؤکَّد کے اعراب کے مطابق ہوتا ہے (جیسا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

علامتِ نصب " لام " کی فتحہ (ـَـ) ہے ۔ جو آگے مضاف ہونے کی وجہ سے خفیف (تنوین سے خالی) بھی ہے ۔ اس کے بعد " ھا " ضمیر مجرور مضاف الیہ ہے اور یہ وہ ضمیر ہے جو تاکید معنوی کے کلمات (عین، کل وغیرہ) کے بعد آتی ہے اور جو ہمیشہ (بلحاظ جنس و عدد) اپنے مؤکّد کے مطابق ہوتی ہے۔ یہاں لفظ " الاسماء " مؤکّد (متبوع) ہے اور چونکہ وہ جمع مکسر ہے اس لیے ضمیر مجرور واحد مؤنث (ھا) لائی گئی ہے اور " الاسماء " کے منصوب ہونے کی وجہ سے کلمۂ تاکید (کل) بھی منصوب ہے۔

(۲) **دوسرا ضمنی جملہ** " ثم عرضھم علی الملئکۃ " ہے ۔ جس میں [ثُمَّ] حرفِ عطف ہے جس سے بعد والا جملہ سابقہ جملے پر عطف ہے۔ [عرضھم] میں " عرضَ " فعل ماضی معروف مع ضمیر الفاعل "ھو" ہے ۔ جس کا مرجع " اللہ تعالیٰ " ہے ۔ اور ضمیر منصوب "ھم" یہاں اس فعل کا مفعول بہ ہے (یعنی سامنے کیا "ان" کو) ۔ یہاں ضمیر "ھم" کا مرجع کیا ہے ؟ اور "عرض" یعنی پیش کرنے کا طریقہ کیا تھا ؟ اس پر تفصیلی بحث تو کسی مستند تفسیر میں دیکھی جاسکتی ہے ۔ البتہ نحوی اعتبار سے یہاں یہ ضمیر ان " مسمّیات " کے بارے میں جن کے نام سکھائے گئے اور چونکہ اس میں عاقل اور غیر عاقل ہر طرح کی چیزوں کے نام شامل تھے لھذا اہلِ عرب کے اندازِ کلام کے مطابق ضمیر " عاقلوں " کے لیے لائی گئی ہے ۔ جیسے مذکر مؤنث کے مجموعی ذکر (بطور مبتدأ یا فاعل یا مفعول وغیرہ) میں صیغۂ مذکر ہی اختیار کیا جاتا ہے ۔ یہ کلام عرب کی خصوصیت اور اس لئے نحو کا مشہور قاعدہ ہے ۔ [علی الملائکۃ] جار مجرور مل کر متعلق فعل (عرضَ) ہیں ۔ جس میں فعل " عرض " کے بارے میں وضاحت ہے یعنی کس کے سامنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کہ تمام توابع اعراب میں اپنے متبوع کے مطابق ہوتے ہیں) ۔ کلمہ تاکید کے بعد ہمیشہ ایک مجرور (مضاف الیہ) ضمیر آتی ہے جو اپنے متبوع کے موافق (جنس، عدد وغیرہ میں) ہوتی ہے ۔ ضرورت ہو تو نحو کی کسی کتاب میں سے توابع کے بیان میں " تاکید " کے قواعد پر نظر ڈال لیں ۔

پیش کیا ؟" کا جواب ہے۔
(۳) تیسرا ضمنی جملہ " فقال انبئونی باسماء ھؤلاء ان کنتم صادقین " ہے۔ اس میں [فقال] کی فاء (فَ) عاطفہ ہے جس میں پہلے اور دوسرے جملے میں بیان کردہ (چیز یا کام) میں ترتیب کا مفہوم ہوتا ہے۔ (یعنی پھر، اس کے بعد)۔ اور " قال " فعل ماضی معروف مع ضمیر الفاعل " ھو " ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اسی ترتیب والے مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے بعض مترجمین نے یہاں " فقال " کا ترجمہ " پیش کرکے فرمایا " کے ساتھ کیا ہے۔
[انبئونی] (یہ اس کا رسم املائی ہے رسم عثمانی پر آگے بات ہوگی) میں " انبئوا " فعل امر کا صیغہ (جمع مذکر حاضر) ہے جس میں آخری واو الجمع ضمیر فاعلین " انتم " کے لیے ہے اور " نی " میں نونِ وقایہ اور " ی " ضمیر منصوب متصل ہے۔ اس طرح کلمہ " نی " یہاں فعل " انبئوا " کا مفعول بہ ہے۔ اور ضمیر ساتھ لگنے سے فعل " انبئوا " کی واو الجمع کے بعد والا (آخری زائد الف گر جاتا ہے۔ [باسماء] میں " بِ " جار ہے اور یہ وہ صلہ ہے جو فعل " انبأَ " کے مفعول ثانی پر داخل ہوتا ہے اور " اسماء " مجرور ہے اور " اسماء " آگے مضاف ہونے کی وجہ سے خفیف ہے یعنی اسماءٍ کی بجائے " اسماءِ " رہ گیا ہے۔ اور [ھؤلاءِ] اسم اشارہ قریب برائے جمع (مذکر و مؤنث) ہے اور یہ ہمیشہ مبنی بر کسرہ ہوتا ہے۔ یعنی اس لفظ کے آخر پر تینوں حالتوں میں کسرہ (ـِ) ہی رہتی ہے۔ یہاں یہ " ھؤلاءِ " لفظ " اسماءِ " کا مضاف الیہ ہو کر مجرور ہے اور یہ پورا مرکب جاری (باسماء ھؤلاءِ) ایک لحاظ سے فعل " انبئونی " کے مفعول ثانی کا کام دینے کی وجہ سے محلاً منصوب قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ لغوی اعتبار سے " انبئونی باسماء ھؤلاءِ " کو غیر قرآن میں " انبئونی اسماءَ ھؤلاءِ " کہنا درست ہے۔ اسی لیے اس ترکیب کے اردو ترجمہ میں اس صلہ (بِ) کو نظر انداز کرنا پڑا اور اسی لیے اس کا بالکل لفظی ترجمہ " مجھے خبر دو ساتھ ان کے ناموں کے " کی بجائے تمام

مترجمین نے اس کا ترجمہ "مجھے ان کے نام بتاؤ" سے کیا ہے۔ ("انبأہ الخبر اور انبأہ بالخبر" کے استعمال پر اوپر حصہ "اللغۃ" میں بات ہو چکی ہے)۔
[اِنْ] حرفِ شرط ہے [کنتم] فعل ناقص صیغہ ماضی ہے جس میں اس کا اسم "انتم" مستتر ہے۔ یہاں "کنتم" کو "اِنْ" کی وجہ سے محلاً مجزوم کہہ سکتے ہیں اگرچہ صیغۂ ماضی ہونے کے باعث اس پر "اِن" جازمہ سے کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ [صادقین] خبر کان (کنتم) ہے۔ اس لیے منصوب ہے علامتِ نصب اس کے آخری "نون" سے پہلے والی یائے ماقبل مکسور (ـِـی) ہے۔ اس شرطیہ جملے (ان کنتم صادقین) کا جواب شرط یا تو اس جملے کے بعد ایک مقدر "فَأنبئونی" ہے (یعنی اگر تم سچے ہو تو پھر مجھے بتاؤ) ـــ یا جوابِ شرط پہلے (بصورت "انبئونی باسماء ھؤلاءِ") آگیا ہے۔ یعنی اس عبارت کی سادہ نثر یوں ہے "ان کنتم صادقین (فَ) انبئونی باسماء ھؤلاء" ـــ اور یہ ساری عبارت ابتدائی "فقال" کا مقول ہو کر محلِ نصب میں ہے۔

(۲) قالوا سبحٰنکَ ـ لاعلمَ لنا الا ما علمتنا ـ انک انت العلیم الحکیم۔ بلحاظِ اعراب یہ آیت بھی بنیادی طور پر تین جملوں پر مشتمل ہے جو مل کر ابتدائی فعل "قالوا" کے مقول ہیں۔ [قالوا] فعل ماضی معروف مع ضمیر فاعلین "ھم" ہے جو یہاں فرشتوں (الملائکہ) کے لیے ہے۔ اس کے بعد
۱۔ پہلا جملہ [سبحانک] ہے یہ بظاہر مرکب اضافی ہے لیکن دراصل اس سے پہلے ایک فعل "نسبّح" محذوف ہے (ہم پاکیزگی بیان کرتے ہیں)۔ اس فعلِ محذوف کی وجہ سے ہی "سبحانَ" منصوب ہے کیونکہ یہ اس فعل کا مفعول مطلق ہو کر استعمال ہوا ہے (اصل مصدر "تسبیح" تھا مگر عربی میں اصل باب کی بجائے کسی دوسرے ہم معنی باب کا مصدر بھی بطور مفعول مطلق استعمال کر لیا جاتا ہے)۔ اور یہ منصوب مفعول مطلق (جو دراصل سبحاناً تھا) یہاں

آگے مضاف ہونے کی وجہ سے خفیف (سبحانَ) رہ گیا ہے اور اس کا مضاف الیہ آخر پر ضمیر مجرور "کَ" ہے اور یہ لفظ (سُبْحَان) ہمیشہ مضاف ہوکر ہی استعمال ہوتا ہے اور اس کا مضاف الیہ اسم ظاہر بھی ہوسکتا ہے، اسم موصول بھی یا کوئی ضمیر بھی۔ مثلاً "سبحان اللہ، سبحانَ ربّی، سبحانَ مَنْ لا ینسی (جو بھولتا نہیں) سبحانہ" وغیرہ کی صورت میں ــــ ان تمام صورتوں میں "سبحان" کا بامحاورہ ترجمہ "پاک ہے" کیا جاتا ہے (دیکھئے حصہ "اللغۃ" ۲ : ۲۲ : ۱ (۶))

● بعض نحویوں نے یہاں "سبحانَکَ" میں لفظ "سبحان" کی نصب کی ایک اور توجیہ بھی بیان کی ہے۔ ان کے نزدیک یہاں (بلکہ ہر جگہ) "سبحان" کو منادی مضاف قرار دے کر منصوب سمجھا جاسکتا ہے[1]۔ ہمارے خیال میں یہ بھی ایک عمدہ توجیہ ہے۔ قرآن کریم میں "یاحسرتیٰ"، "یا ویلتیٰ" کی صورت میں اس سے ملتی جلتی تراکیب موجود ہیں۔ اس طرح "سُبْحانَکَ" کا لفظی ترجمہ "اے تیری پاکیزگی" (جیسے "ربّنا" کا مطلب "اے ہمارے رب" ہے)۔ بہر حال نصب کی وجہ مفعول مطلق ہونا سمجھیں یا منادی مضاف ہونا اس (سبحانکَ) کا بامحاورہ اردو ترجمہ جملہ اسمیہ کی صورت میں "تو پاک ہے" کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ایک آدھ مترجم نے "پاکی ہے تجھے" کے ساتھ بھی ترجمہ کیا ہے جو لفظی ترجمہ "تیری پاکی" سے قریب تر ہے۔

۲۔ دوسرا جملہ "لاعلم لنا الا ما علمتنا" ہے۔

اس میں [لا] نفی الجنس کے لیے ہے جو اپنے اسم کو نصب دینے میں حروف مشبہ بالفعل سے مشابہ ہے (اس فرق کے ساتھ کہ اس کے اسم پر تنوین نصب نہیں آتی۔ یعنی دو کی بجائے ایک فتحہ (ـَـ) رہ جاتی ہے۔ [عِلمَ] یہ اس لائے نفی جنس کا اسم ہے جو منصوب ہے مگر مبنی بر فتحہ (کی طرح) ہے۔ [لَنَا] جار (ل) اور مجرور (نا) مل کر "لا" کی محذوف خبر (مثلاً موجودٌ یا کائنٌ یا ثابتٌ وغیرہ) سے متعلق

---

[1] دیکھئے اعراب القرآن للنحاس، ج ا، ص ۲۱۰

ہیں۔یعنی اس میں اس سوال کا جواب ہے کہ یہ "کسی قسم" کا علم "کس" کے پاس نہیں ہے؟ [اِلاَّ] حرفِ استثناء ہے اور یہ نفی کے بعد آئے تو "حصر" (محدود کر دینا) کے معنی پیدا کرتا ہے اس لیے اس (اِلاّ) کا بامحاورہ اردو ترجمہ "مگر اتنا ہی" ، مگر وہی" سے کیا جاتا ہے۔ [مَا] اسم موصول ہے بمعنی "جو کچھ کہ"۔ اس طرح "اِلاَّ مَا" کا ترجمہ "مگر اتنا ہی جو کچھ کہ" بنتا ہے جس کی مزید بامحاورہ صورت "مگر جتنا" اختیار کی گئی ہے۔ [عَلَّمْتَنَا] یہ جملہ فعلیہ ہے۔ (جو فعل ماضی مع ضمیر فاعل "انتَ" اور ضمیر مفعول "نا" پر مشتمل ہے اور اس میں ایک ضمیر عائد محذوف بھی ہے یعنی دراصل "علمتناہ" تھا) اور یہ موصولی (مَا) کا صلہ ہے۔ اور یوں یہ صلہ موصول مل کر (ما علّمتنا) محلاً مرفوع ہے۔ کیونکہ لائے نفی جنس کے بعد جب "اِلاّ" آئے اور "اِلاّ" سے پہلے لائے نفیِ جنس کی خبر محذوف ہو تو پھر "اِلاّ" کے بعد والا اسم مرفوع ہوتا ہے جیسے "لا اِلٰہَ الا اللّٰہُ" میں "اللّٰہُ" مرفوع ہے ــــ اگر "لا" کی خبر "اِلاّ" سے پہلے موجود ہو یعنی اِلاّ سے پہلے کلامِ تامّ (مکمل جملہ) ہو تو "اِلاّ" کے بعد والے اسم کو مستثنیٰ "بالاّ" سمجھ کر منصوب پڑھتے ہیں (اگر وہ کوئی جملہ ہو تو محلاً منصوب ہوگا) مثلاً اگر جملہ "لَا اِلٰہَ موجودٌ" ہو تو اس کے بعد "اِلاَّ اللّٰہَ" (منصوب) پڑھ سکتے ہیں۔

نحوی نقطۂ نظر سے یہاں "مَا" کو موصولہ کی بجائے مصدریہ بھی سمجھا جاسکتا ہے یعنی "اِلا ما علمتنا" کی تقدیر (اندازہ کے مطابق عبارت) مصدر مؤوّل (فعل سے مصدر بنا کر) کے ساتھ کچھ یوں ہوگی "اِلاّ تعلیمَکَ ایّانا" اس میں "تعلیم" (جو "عَلَّم" کا مصدر مؤوّل ہے) کی رفع کی وجہ وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ دوسری تقدیر عبارت "اِلاّ علمٌ علمتناہ" ہو سکتی ہے۔ اس میں "علمٌ" نکرہ موصوفہ ہو کر وہی اسم موصول والے معنی (جو کہ) دے گا۔

● بہرحال "مَا" کو موصولہ سمجھ کر ترکیبِ نحوی کو سمجھنا نسبتاً آسان ہے۔ اور بامحاورہ اردو ترجمہ کے لیے موزوں بھی ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اردو کے کسی مترجم نے بھی یہاں "مَا" کو مصدریہ سمجھ کر ترجمہ نہیں کیا۔

۳۔ تیسرا ضمنی جملہ "اَنَّكَ انت العلیم الحکیم" ہے۔

اس میں [اِنَّكَ] "اِنَّ" اور اس کے اسم (ضمیر منصوب متصل "كَ") پر مشتمل ہے۔ [اَنْتَ] ضمیر فاصل ہے جس کا اردو ترجمہ "تو ہی" یا "تُو ہی تو" ہے۔ اور [العلیمُ] "اِنَّ" کی خبر اول (لھذا) مرفوع ہے۔ اور [الحکیمُ] اسی "اِنَّ" کی خبر ثانی (لھذا یہ بھی) مرفوع ہے۔ ان دونوں خبروں میں علامتِ رفع آخری "میم" کا ضمہ (ـُـ) ہے۔ دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہاں "اَنت" کو (جو ضمیر مرفوع منفصل ہے) مبتدأ سمجھا جائے اور "العلیم الحکیم" کو اس کی دو معرفہ خبریں (اول ثانی) سمجھا جائے اور یہ پورا جملہ اسمیہ (انت العلیم الحکیم) "اِنَّ" کی خبر قرار دیا جائے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "الحکیم" کو "العلیم" کی صفت سمجھا جائے (بعض نحویوں کے نزدیک صفت کی صفت لائی جاسکتی ہے[1]) یعنی ایسا "العلیم" جو "الحکیم" بھی ہے۔ (اور حصہ "اللغۃ" میں یہ بیان ہوچکا ہے کہ یہاں "الحکیم" "حکمت والا" کے علاوہ "حاکم" (فیصلہ کرنے والا) اور "مُحکِم" (پختہ کار) دونوں معنی میں لیا جاسکتا ہے)۔ ــــ اس طرح بھی "العلیم الحکیم" مرکب توصیفی ہوکر "انت" کی خبر معرفہ ہوگا اور خبر کی تعریف (معرفہ ہونا) کی بنا پر بھی اردو ترجمہ میں "ہی" کا اضافہ ہوگا یعنی "تو علیم و حکیم ہی تو ہے"۔ اور اس صورت میں بھی یہ جملہ "انت العلیم الحکیم" "اِنَّ" ہی کی خبر بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اردو مترجمین نے ان دو کلمات (العلیم اور الحکیم) کے ترجمہ میں ان کے درمیان "اور" لگانے

---

[1] التبیان (للعکبری)، ج ۱، ص ۴۹ و اعراب القرآن (للنحاس) ج ۱، ص ۲۱۱

سے گریز کیا ہے ۔ یعنی دو خبروں کی بجائے صفت موصوف سمجھ کر ترجمہ کیا ہے ۔

۲ : ۲۲ : ۳ الرسم

اس (زیرِ مطالعہ) قطعۂ آیات کے بیشتر کلمات کا رسم عثمانی اور رسم املائی (عام املاء) یکساں ہے ۔ صرف چھ کلمات کا رسم توجہ طلب ہے یعنی ۔ " ادم ۔ الملئکۃ ۔ انبونی ۔ ھؤلاء ۔ صدقین اور سبحنک " ۔ تفصیل یوں ہے :

(۱) " اٰدَمُ " : یہ لفظ عام املاء میں اور قرآن کریم میں بھی اسی طرح ایک الف کے ساتھ (ادم) لکھا جاتا ہے بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ تمام اسماء و افعال جو مھموز الفاء مادہ سے ہوں ۔ جب " اَفْ " یا " فَا " کے وزن سے شروع ہوں (یعنی اَاُ یا اَا کی صورت میں) تو یہ " اَفْ " یا " فَا " صرف ایک " ا " کی شکل میں لکھے جاتے ہیں یعنی صرف ایک الف کی شکل میں جس سے پہلے یا بعد کا ایک ھمزۂ متحرکہ یا ساکنہ لکھنے میں محذوف کر دیا جاتا ہے [1] مگر پڑھا جاتا ہے اس لیے اس کو بذریعہ ضبط ظاہر کرنے کے مختلف طریقے ہیں (جس کا بیان ضبط میں آئے گا) یہ قاعدہ اس سے پہلے لفظ " الاخرۃ " (البقرہ : ۴) کے ضمن میں بھی مفصل بیان ہوا تھا [دیکھئے ۲ : ۳ : ۳ اور ۲ : ۳ : ۴ میں] ۔

(۲) المَلٰئِکَۃ : جس کا رسم املائی " الملائکہ " ہے ۔ اس کے رسم عثمانی پر اس سے پہلے البقرہ : ۳۰ یعنی ۲ : ۲۱ : ۳ (۴) میں بھی بات ہوئی تھی کہ یہ لفظ قرآن کریم میں ہر جگہ بحذف الالف بعد اللام لکھا جاتا ہے ۔ اور ترکی، ایران اور بعض دفعہ برصغیر کے مصاحف میں جو اسے رسم املائی کی طرح لکھنے کا رواج نظر آتا ہے، یہ رسم عثمانی کی صریح خلاف ورزی ہے ۔

(۳) اَنْبِئُوْنِیْ : جس کی رسم املائی " انبئونی " ہے ۔ یہ لفظ مصاحف عثمانی میں " انبونی " (حرکات و نقاط یعنی شکل کے بغیر) لکھا گیا تھا ۔ [بلکہ ایک آدھ

---

[1] اس حذف کی بحث کے لیے دیکھئے نثر المرجان، ج ۱، ص ۱۲۶

قراءت (خارج از سبعہ) میں یہ لفظ اسی رسم کی بناء پر "انبئُونی" بروزن "أعطونی" ــ لام کلمہ کے سقوط کے ساتھ ــ بھی پڑھا گیا ہے[1]] اور اس رسم (انبونی) کی ایک وجہ یہ بھی بیان ہوئی ہے کہ دراصل تو یہ "انبؤونی" تھا ـ کیونکہ اس زمانے کی املاء کے لحاظ سے ہمزۂ مضمومہ ہمیشہ "و" پر لکھا جاتا تھا بلکہ یوں کہیے کہ ہمزۂ مضمومہ کی بجائے بھی صرف "و" لکھی جاتی تھی ـ (ہمزہ، حرکات اور نقاط تو بعد کی ایجاد ہیں) ــ اور ماقبل مضموم یا مفتوح ہونے کی صورت میں اب بھی یہی (ہمزہ کو "واو" پر لکھنے کا) قاعدہ ہے ـ کسرہ کا قاعدہ بدلا ہے جیسا کہ ابھی بیان ہوگا] ـ تاہم رسم عثمانی (یعنی مصاحفِ عثمانی) میں دو الف یا دو واو یا دو یاء جمع ہونے کی صورت میں صرف ایک الف، ایک واو اور ایک یاء ہی لکھے گئے تھے جس کی مثال علی الترتیب اادم = ادم، داوود = داود اور امیین = امین ہے ـ رسم عثمانی کے اس قاعدہ (جو بعد میں علمائے رسم نے مصاحفِ عثمانی کی املاء پر غور کرنے کے بعد مستنبط کیا) کی بناء پر ہی "انبودنی" کو "انبونی" لکھا گیا (نقطوں کے بغیر) ـ پھر جب ضبط کے لیے "ب" اور "و" کے درمیان ہمزہ (ء یا E یا S وغیرہ کی شکل میں) ڈالا گیا تو دوسری تیسری ہجری کے بعد ہونے والے قواعدِ املاء کے مطابق یہاں یائے مہملہ (نقطوں کے بغیر) کا نبرہ (دندانہ) جسے مرکز ہمزہ بھی کہتے ہیں لکھنا چاہیے تھا کیونکہ اب ہمزۂ متوسطہ مضمومہ صرف ماقبل کے ضمہ (ـُ) یا فتحہ (ـَ) کی صورت میں ہی "و" پر لکھا جاتا ہے جب کہ کسرہ (ـِ) کے بعد اسے نبرۂ یاء (یاء کے دندانہ) پر لکھا جاتا ہے[2] تاہم قرآن کریم کے اصل رسم عثمانی پر ایک نبرہ (دندانہ) کا اضافہ بھی جائز نہ سمجھا گیا ـ اور اسی لیے (جیسا کہ آپ آگے "الضبط" میں دیکھیں گے) اس ہمزہ کو یہاں ہمیشہ بغیر نبرہ (دندانہ) کے "ب" اور "و" کے درمیان ہی لکھا جاتا

---

[1] اتحاف فضلاء البشر (للبناء) ج ۱ ص ۳۸۴ اور کتاب الاشارات (بابڑ زئی)، ص ۲

[2] کتاب الکتاب (لابن دستوریہ)، ص ۱۳ ـ نیز نخبۃ الاملاء (للخلیفہ)، ص ۱۴

ہے ۔صرف ایرانی مصاحف میں اس لفظ کو عام عربی املاء کی طرح بصورت" ابنٶنی" لکھنے کا رواج ہوگیا ہے ۔ جو رسم قرآنی کی خلاف ورزی ہے ۔

(۴) هٰٓؤُلَآءِ : جس کی مصاحف عثمانی کی املاء " ھولا " تھی (حرکات کی طرح ہمزہ کی علامت بھی بعد کی ایجاد ہے) جو اگرچہ روایتِ حفص کے مطابق " ھَاؤُلَاءِ" کی طرح پڑھا جاتا ہے ۔ تاہم اس کے آخری ہمزہ اور اگلے لفظ (اِنْ) کے اجتماع ھمزتین کی بنا پر " ھٰؤ لاء اِن " کے مختلف قراءات میں پڑھنے اور ان کے مطابق ضبط کے بھی مختلف طریقے ہیں[1] ۔ جو ہمارے موضوع سے خارج ہیں کیونکہ ہمارا دائرہ کار روایتِ حفص تک محدود ہے[2]

● بہرحال یہ لفظ پہلے الف (بعد الھاء) کے حذف کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور پہلے ھمزہ کے مضموم ہونے کے باعث اس کے لیے " واو "(کی کرسی) ڈالی جاتی ہے (یعنی ھمزہ " ؤ " پر لکھا جاتا ہے) اور اس لفظ کی یہی املاء (ھٰؤلاء) عام عربی املاء کے لیے بھی اختیار کر لی گئی ۔خیال رہے کہ اس میں ھمزہ کی مکتوبی علامت یا شکل (ء ، E ، S وغیرہ) بعد کی ایجاد ہے ۔ اگرچہ ھمزہ پڑھا پہلے بھی جاتا تھا ــــ گویا اس لفظ کی املاء صوتی اصول کے تحت نہیں بلکہ تاریخی اصول" کے تحت اختیار کی گئی اور یوں اس کی عام املاء بھی (بہت سے دوسرے کلمات کی طرح) رسم عثمانی کی یادگار ہے[3]

---

[1] جس کی تفصیل قراءات کی کسی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے مثلاً اتحاف فضلاء البشر (للبنا) ج ا ص ۳۸۴ بعد ۔ یا الغایۃ (للنیسابوری) ص ۹۹ ــــ اور دراصل تو یہ کسی ماہرِ قراءات قاری سے سننے کی چیز ہے ۔

[2] دیکھئے مقدمہ لغات و اعراب ۔ ماہنامہ حکمت قرآن فروری ۱۹۸۹ء ص ۲۰ - ۱۹ ۔

[3] اس لفظ کی عام املاء کے قواعد کے لیے دیکھئے کتاب الکتاب (لابن درستویہ) طبع بیروت ص ۳۴ ۔ نیز نخبۃ الاملاء (للخلیفہ) ص ۵۹ ۔ اور اسی لفظ کے قرآنی رسم کے قاعدہ کے لیے دیکھئے تلخیص الفوائد (شرح العقیلہ) ص ۴۲

(۵)، صدقین : جس کی عام عربی املاء " صادقین " ہے - یہ لفظ قرآن کریم میں ہر جگہ رسم عثمانی کے مطابق بحذف الالف بعد الصاد لکھا جاتا ہے - بلکہ وزن " فاعل " والے تمام کلمات کی جمع مذکر سالم میں حذف الف (بعض مستثنیات کو چھوڑ کر) قریب قریب ایک قاعدہ کلیہ ہے[۱] بہر حال ہم انشاء اللہ محض اصول رسم بیان کرنے کی بجائے ایک ایک کلمہ کے رسم پر (حسب موقع) الگ الگ بات کریں گے۔ اس لفظ کو بھی ایرانی اور ترکی مصاحف میں باثبات الف (صادقین) لکھنے کی غلطی عام ہے -

(۶) سُبۡحٰنَكَ : اس کی عام املاء (رسم املائی) " سبحانك " ہے - تاہم قرآن کریم میں یہ لفظ یہاں بحذف الالف بعد الحاء (سُبۡحٰنَكَ) لکھا جاتا ہے یہ لفظ (سبحٰن) قرآن کریم میں اکتالیس بار آیا ہے - اور ہر جگہ اسی طرح بحذف الف (سُبۡحٰنَ) لکھا جاتا ہے ماسوائے ایک جگہ (الاسراء : ۹۳) کے جہاں بعض روایات کے مطابق اسے باثبات الف (سبحان) لکھا جاتا ہے[۲]

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کسی بھی قطعہ زیر مطالعہ کی ابتداء میں ہم آیت یا آیات کو رسم عثمانی کے مطابق ہی لکھتے ہیں - آگے " اللغۃ " " الاعراب " یا " الرسم " میں زیر بحث لکھتے وقت ہم بعض دفعہ قاری کی آسانی کے لیے بعض کلمات کو رسم املائی کے ساتھ لکھ کر بھی مزید وضاحت کرتے ہیں - اس چیز کی طرف " مقدمۂ کتاب " میں بھی اشارہ کیا گیا تھا -

۲ : ۲۲ : ۴ الضبط

زیر مطالعہ دو آیات کے کلمات میں ضبط کے اختلاف کو مندرجہ ذیل

---

[۱] اس کے تفصیلی بیان کے لیے دیکھیے المقنع (للدانی) طبع دمشق ص ۲۲ - سیر الطالبین (للضباع) ص ۳۲ اور لطائف البیان (لزیتحاد)، ج ۱ ص ۱۵ -

[۲] دیکھیے المقنع ص ۹۴ اور سیر الطالبین ص ۴۳ -

نمونوں کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے ۔ البتہ ان الفاظ میں سے ایک لفظ "انبِئُونِیْ" ایسا ہے کہ اس کے ضبط کے بارے میں چند باتیں قابلِ ذکر ہیں ۔ لھذا یہ بحث ہم پہلے کر لیتے ہیں :

● تجوید کا قاعدہ یہ ہے کہ نون ساکنہ کے بعد "باء (ب)" آئے تو اس "نون" کا تلفظ "میم" میں بدل جاتا ہے ۔ بعض ملکوں کے مصاحف میں اس "اقلاب نون بمیم" کو ظاہر کرنے اور قاری کو بر وقت متنبہ کرنے کے لیے اس "نون" پر ایک باریک سی "میم" ڈال دیتے ہیں (نۢ) پھر اس "میم" کے ساتھ علامت سکون ڈالنے یا نہ ڈالنے میں اختلاف ہے — عرب اور بیشتر افریقی ملکوں کے مصاحف میں عموماً اس نون ساکنہ کے اوپر یہ "میم صغیرہ" بنا دیتے ہیں اور ساتھ علامتِ سکون نہیں ڈالتے (أَنۢبِ ....) ۔ برصغیر میں نون پر علامتِ سکون ڈال کر ساتھ ہی چھوٹی سی "میم" لکھی جاتی ہے (اَنْۢبِ ....) ، ترکی میں یہ میم صغیرہ ڈالنے کا رواج نہیں ہے ۔ معلوم نہیں وہاں کا قاری کس طرح اس نون کو میم پڑھتا ہے ؟ بعض افریقی ملکوں میں نون کے اوپر علامتِ سکون کی بجائے نیم گول دائرے کی شکل میں "میم" لکھتے ہیں (اَنۢبِ ....) ۔ جب کہ تجویدی قرآن (مطبوعہ پاکستان) میں "ن" کے اوپر باریک سی "م" لکھ کر پھر اس کے اوپر بڑی سی علامتِ سکون نیم دائرہ کی شکل میں لکھی گئی ہے یعنی (اَنۢبِ) کی شکل میں ۔

● اس کلمہ "انبئونی" کے ضبط میں دوسرا اہم فرق "ب" کے بعد آنے والے ھمزہ کا طریقِ ضبط ہے ۔ چونکہ بلحاظ رسم یہ لفظ "انبونی" ہے (درمیانی نبرہ یا دندانہ کے بغیر) اور عام قواعد املاء (عربی) کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں "ب" اور "و" کے درمیان ھمزہ ایک نبرہ (دندانہ) پر لکھا جائے[1] اس لیے ایران اور وسط

---

[1] "انبئونی" کے رسم و ضبط پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھئے نثر المرجان ج ص ۱۲۷ ۔ نیز اسی قطعہ کی بحث الرسم میں اس کلمہ (انبونی) پر بحث یعنی ۲:۲۲:۳ (۳)

ایشیا کے بعض ممالک میں یہاں ایک دندانے (نبرہ) کا اضافہ کر کے اس لفظ کو "اَ نۡبِئُوۡنِی" لکھا جاتا ہے جو رسم عثمانی کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اور (جیسا کہ اوپر بحث "الرسم" میں بیان ہوا ہے) یہ لفظ دراصل "انبوونی" تھا۔ جس میں پہلی "و" تو مرکز ھمزۂ مضمومہ (مضموم ھمزہ کی کرسی) کے لیے تھی اور دوسری "و" صیغۂ جمع (مخاطب) کی واوالجمع تھی۔ مگر اجتماع مثلین (ایک ہی حرف علت کا دوبارہ یکجا واقع ہونا) کی وجہ سے ایک واو محذوف کر دی گئی۔ تاہم اس میں یہ اختلاف ہوا کہ دراصل پہلی واو (ھمزہ والی) حذف ہوئی ہے یا دوسری (واوالجمع)۔ جن لوگوں نے پہلی واو (مرکز ھمزہ والی) کو محذوف سمجھا انہوں نے واو ثابتہ (جو حذف نہیں ہوئی) سے پہلے کسی نبرہ یا مرکز کے بغیر ہی ھمزہ لکھا۔ چنانچہ برصغیر، عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف میں یہ ھمزہ "ب" اور "و" کے درمیان بغیر نبرہ (دندانہ) کے لکھا جاتا ہے (البتہ ھمزہ کی شکل مختلف ہوتی ہے۔ یعنی ء، ى، ع وغیرہ) ـــــ اس (ھمزہ) کے بعد برصغیر میں تو اس ھمزہ پر ضمہ (ــُـ) اور مابعد کی ساکن واو پر علامت سکون بھی ڈالتے ہیں۔ جب کہ عرب اور افریقی ممالک میں اس (آخری) واو کو علامت ضبط سے خالی رکھا جاتا ہے۔ مصحف الحلبی (مطبوعہ قاہرہ) میں یہ ھمزہ ٹھیک واو کے اوپر لکھ کر اس کے اوپر ہی ضمہ معکوس یعنی الٹا پیش (ـٗـ) لکھا گیا ہے یعنی "انبؤٗنی" (داؤد کی طرح) ــــ جب کہ ترکی میں اس ھمزہ کو "و" کے اوپر لکھ کر اس (و) کے نیچے باریک سا لفظ "مدّ" لکھ دیا جاتا ہے۔ "(انبؤُنی)" جس طرح وہ "اولٓئک" کی واو سے پہلے الف کے نیچے باریک سا لفظ "قصر" لکھ دیتے ہیں۔ تاہم ترکی والوں کا یہ طریق ضبط نہایت ناقص ہے۔ اس سے عام قاری (ناظرہ خوان) کسی طرح بھی کلمہ کے درست تلفظ سے بروقت آگاہ نہیں ہو سکتا۔

● اس لفظ "انبئونی" کے ضبط کا ایک عام فرق آخری یائے ساکنہ (ماقبل مکسور) کو علامت ضبط سے عاری رکھنے یا نہ رکھنے اور اس کے ماقبل (نون)

کے نیچے کسرہ (ـِ) یا علامتِ اشباع (ـٖ) ڈالنے کا ہے ۔
اس طرح اس لفظ (انبئونی) کے ضبط کی چھ مختلف صورتیں ہمارے سامنے آتی ہیں ۔ جن کو درج ذیل نمونوں کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے ۔

وَعَلَّمَ ، عَلَّمَ / اٰدَمَ ، ءَادَمَ ، اٰدَمَ ، ءَادَمَ /
الْاَسْمَآءَ ، الْاَسْمَاءَ ، اَلْاَسْمَاءَ ، اَلْاَسْمَآءَ /
كُلَّهَا ، كُلَّهَا / ثُمَّ عَرَضَهُمْ ، عَرَضَهُمْ /
عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ، الْمَلٰٓئِكَةِ ، اَلْمَلٰٓئِكَةِ ،
اَلْمَلٰٓئِكَةِ ، اَلْمَلٰٓئِكَةِ / فَقَالَ ،
فَقَالَ ، فَقَالَ / اَنْۢبِـُٔوْنِيْ ، اَنْۢبِـُٔوْنِيْ ،
اَنْۢبِـُٔوْنِيْ ، أَنْبِئُونِي ، ءَانْبِئُونِي ، اَنْبِئُونِي /
بِاَسْمَآءِ ، بِاَسْمَاءِ ، بِأَسْمَآءِ ، بِاَسْمَاءِ /
هٰٓؤُلَآءِ ، هٰؤُلَاءِ ، هٰٓؤُلَآءِ ، هٰٓؤُلَاءِ /
اِنْ ، إِنْ ، اِنْ / كُنْتُمْ ، كُنْتُمْ ، كُنْتُمْ /
صٰدِقِيْنَ ، صٰدِقِيْنَ ، صٰدِقِيْنَ ، صٰدِقِيْنَ /
قَالُوْا ، قَالُوا ، قَالُوْا ، قَالُوْا / سُبْحٰنَكَ ،
سُبْحٰنَكَ ، سُبْحٰنَكَ / لَا ، لَا ، لَا /

(باقی صفحہ ۸۷ پر)

تبصرۂ کتب

ترتیبِ نزولِ قرآن کریم
از پروفیسر محمد اجمل خان قیمت ۳۵/- روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ حنفیہ، نزد ڈاک خانہ اردو بازار، گوجرانوالہ

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر دو نام بہت معروف ہیں ' اجمل صاحب اور ہمایوں کبیر صاحب! ثانی الذکر کی جمع و ترتیب سے مولانا کی معروف کتاب "ہماری آزادی" سامنے آئی تو اجمل صاحب خود بڑے عالم و فاضل تھے جن کی فضیلتِ علمی کا شاہکار ایک تو ان کی زیرِ تبصرہ کتاب ہے اور ایک دوسری کتاب "سیرتِ نبویؐ از روئے قرآن کریم" ہے ' جس کے تین مسودات مرحوم نے تیار کئے: مختصر ' متوسط اور مطول۔ ان میں سے پہلے دو چھپ چکے ہیں جبکہ تیسرا ہمدرد سنٹر دھلی کے جناب حکیم عبدالحمید خان صاحب کے پاس ہے۔ دیکھیں اس کی اشاعت کب ہو؟

میرے کرم فرما محترم یوسف سلیم چشتی مرحوم نے اپنی کتابوں میں سے اجمل خان کی ان دو کتابوں "ترتیبِ نزولِ قرآن" اور "سیرت نبویؐ از روئے قرآن" (متوسط) استفادہ کے لئے عنایت کر کے ارشاد فرمایا کہ یہ چھپ جائیں تو خوب ہو گا اور بہت سے لوگوں کا بھلا ہو گا۔

سیرت والی کتاب خوبصورت کتابت کے مرحلوں سے گذر کر اب ناشر کا منہ تک رہی ہے جبکہ "ترتیبِ نزول" چھپ چکی ہے۔ یوں میں سوچتا ہوں کہ صبحِ قیامت چشتی صاحب مرحوم کے سامنے میں شرمندہ نہ ہونگا۔ اس کتاب پر مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی رائے گرامی میرے لئے عجب سرمایہ تھا۔ دور آخر میں جن بزرگوں نے مجھے بے حد متاثر کیا ان میں مولانا سندھیؒ کا نام بڑا اہم ہے۔ ان کی اس کتاب کے متعلق وقیع رائے ہی اس کتاب کے لئے بڑی سند ہے۔ پھر چشتی صاحب کا اس کے لئے اشتیاق ' اور اب محترم حافظ احمد یار صاحب کا اس کی طرف توجہ دلانا ' ایسی باتیں ہیں جن سے اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"حکمتِ قرآن" کے قارئین حافظ صاحب سے خوب واقف ہیں۔ ابھی فروری ۹۲ء کے شمارہ میں ان کا مفصل مضمون "قرآن کریم کی ترتیبِ نزول" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جسے

انہوں نے کمال درجہ محنت اور شوق سے لکھا اور خوب دادِ تحقیق دی (جزاھم اللہ تعالیٰ) اس مضمون میں حافظ صاحب محترم نے اجمل خان مرحوم کی کتاب کے کئی حوالے دئے ہیں اور ایک جگہ لکھا ہے:

"جو اس موضوع پر زیادہ تفصیل کے خواہش مند ہوں وہ پروفیسر محمد اجمل خان کی کتاب "ترتیبِ نزولِ قرآن مجید" کا، خصوصاً ص ۱۹ تا ۲۹ کا مطالعہ کریں، اور ویسے بھی یہ اپنے موضوع پر جامع اور قابلِ مطالعہ کتاب ہے"۔ (ص ۲۶ حاشیہ)

مولانا سندھیؒ نے اجمل صاحب کو نوجوانوں کے لئے قابلِ تقلید شخصیت قرار دے کر ان کی اس محنتؔ کو مفسرین پر احسان سے تعبیر فرمایا کہ انہوں نے اندرونی شہادتوں سے مکی سورتوں کے تعین کا راستہ کھول کر روایات سے پیدا ہونے والے اغلاق کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ (ص ۷)

متحدہ ہندوستان کے معروف قومی اخبار "مدینہ بجنور" میں یہ مقالہ قسط وار چھپا اور اہلِ علم کی تحسین کے بعد ۱۹۴۱ء میں پہلی بار چھپا۔ سالہا سال کی محنت سے مرتب ہونے والا یہ مقالہ قرآن کے طالب علموں پر علم کے نئے دروازے کھولے گا اور مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں ممد و معاون ہوگا۔

سُنّی پبلیکیشنز اور اب مکتبہ حنفیہ اس کی اشاعت پر از حد شکریہ کے مستحق ہیں۔ امید کہ اہلِ علم اس کی قدر کریں گے۔ (علوی)

بقیہ: لغات و اعراب قرآن

عِلْمَ ، عِلْمَ / لَنَا ، لَنَا / اِلَّا ، اِلَّا ، اِلَّا ، اِلَّا / مَا ، مَا / عَلَّمْتَنَا ، عَلَّمْتَنَا / اِنَّكَ ، اِنَّكَ ، اِنَّكَ / اَنْتَ ، اَنْتَ ، اَنْتَ / اَلْعَلِيْمُ ، اَلْعَلِيْمُ ، اَلْعَلِيْمُ ، اَلْعَلِيْمُ / اَلْحَكِيْمُ ، اَلْحَكِيْمُ ، اَلْحَكِيْمُ ، اَلْحَكِيْمُ ۔

ڈاکٹر طاہر سعید کے نام (۱۷)

ڈاکٹر حافظ محمد مقصود

"اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے"

(گذشتہ سے پیوستہ)

اس کے بعد اقبال کہتا ہے کہ بے خدا سائنس کی وجہ سے انسانی قلب و دماغ سے رحمٰن کا نکل جانا اور یہاں شیطان کا ڈیرہ جمالینا کوئی نئی بیماری نہیں، بلکہ وہی پرانی بیماری ہے جس کا علاج کرنے کی خاطر آج سے سینکڑوں سال پہلے قرآن نازل ہوا تھا۔ چنانچہ یہ وہی دیرینہ بیماری اور دل کی وہی نامحکمی ہے جس کا علاج بھی وہی آبِ نشاط انگیز (قرآن) ہے۔ اور کوئی دوسری انسانی تجویز یا منشور یا چارٹر اس قرآن جیسی آبِ نشاط انگیز کا بدل نہیں ہوسکتا۔

پھر اقبال ایک تاریخی حقیقت کا حوالہ دے کر ساقی سے کہتا ہے کہ آج سے ایک عرصۂ دراز پہلے جب بے خدا علمیت، عقلیت اور فلسفہ کی ایک بڑی اور بے خدا چٹان اسلام کے رستے میں حائل ہوگئی تو اللہ تعالےٰ نے اسے توڑنے اور اُس وقت کے بے خدا فکر و فلسفہ کو دندان شکن جواب دینے کا کام رومی جیسے ذہین و فطین فردِ امّت سے لیا۔ مگر آج جبکہ بے خدا فکر و فلسفے کا ایک دوسرا طاغوت جدید مغربی سائنس کی شکل میں نمودار ہو چکا ہے، ایک دوسرے رومی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جو "طلسمِ عصرِ حاضر را شکستم" کے مصداق عصرِ حاضر کے اس شیطانی طلسم کو فاش فاش کر دے عجم کے لالہ زاروں سے مجھے یہ امید تو ہے مگر ابھی تک وہاں سے دوسرا رومی نہ اُٹھ سکا۔ اس پسِ منظر کو اب اقبال کے الفاظ میں سنیے:

لا پھر اِک بار وہی بادہ و جام اے ساقی!
ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی!

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!
شیر مردوں سے ہُوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملّا کے غلام اے ساقی!
عشق کی تیغِ جگردار اُڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

اور

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی؟
وہی دیرینہ بیماری! وہی نامحکمی دل کی!
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!
نہ اُٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

مگر پھر بھی شاعرِ مشرق ناامید نہیں ہے۔ چنانچہ آخر میں اپنا دردِ دل اپنی سدا بہار امیدوں، آرزوؤں اور تمناؤں کی شکل میں پیش کرتے ہیں کہ اسی قوم کے اندر ایسے افراد بالخصوص نوجوان اٹھیں گے جن کے اندر اب بھی سوز اور تڑپ موجود ہے اور اسی خاکستر سے ذہین و فطین نوجوانوں کی شکل میں انشاء اللہ وہ چنگاری اچانک اٹھنے والی ہے جو مشرق و مغرب کی پوری وسعتوں کو اپنے نور سے منور کر دے گی اور یہ مٹی اتنی زرخیز ہے کہ تھوڑی سی نمی پاکر یہ اپنی زرخیزی سے پورے کرۂ ارضی کو باغ و بہار بنا سکتی ہے۔ ؎

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اور یہی حقیقت ہے جس کا اظہار نعیم صدیقی نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ :

ملت کی یہ کھیتی ہے بڑی دیر سے پیاسی
اس خاک کے ہر ذرّے پہ چھائی ہے اُداسی
موسم ہو جو موزوں تو یہ زرخیز ہے خاصی
اس خاک کو نم چاہیئے بس ایک ذرا سی
اس خاک کو سیراب کرو خوں سے خدارا
اے نیل کی موجو نہ کرو خوفِ کنارا!

اس ضرورت کے پیشِ نظر، جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے، محض تبلیغی قسم کی سعی اور جدّ جہد بالکل غیر مفید ہے جو ایک محدود اور جامد مذہبی تصور پیش کر رہی ہو۔ بلکہ ایک ایسی زبردست علمی تحریک کی ضرورت ہے جو گوش بندی اور چشم بندی کی پالیسی ترک کر کے آج تک کے انسان کی علمی کاوشوں کا معروضی جائزہ لے اور قومی، جماعتی، مذہبی اور اسی طرح ہر تعصب سے بالاتر ہو کر حقیقت کی نگاہ سے تجزیہ کرے اور پھر دورِ حاضر کی علمی اور ذہنی سطح (Intellectual Level) کے مطابق فلسفے کا جواب فلسفہ، فکر کا جواب فکر اور دلیل کا جواب دلیل سے دے۔ اس مقصد کے لیے لامحالہ ہمیں اپنی علمی سطح اُس مقام تک پہنچانی ہوگی جہاں پر ہم دنیا کی ذہین اقلیت (Intellectual Minority) کو اُن کی زبان میں مخاطب کر سکیں۔ اگر ہم نے اس ضرورت کا احساس نہیں کیا تو ہماری مثال ایک ایسے اناڑی ڈاکٹر کی بات ہوگی جو اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت جا رہا ہو، مگر انگریزی زبان صحیح طور پر بولنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو۔ چنانچہ یہ خامی اور کمی اس کے لیے ایک شدید رکاوٹ کا باعث بنے گی اور وہ وہاں جا کر نہ خود سمجھے گا، نہ دوسروں کو سمجھا سکے گا۔ کیونکہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے جس ماحول میں جا رہا ہے وہاں کے لیے کم سے کم جس علمی معیار کی ضرورت ہے وہ انگریزی زبان کی صحیح سمجھ بوجھ اور بول چال ہے۔

اسی مثال پر قیاس کرتے ہوئے اگر ہم ایک زبردست علمی تحریک کے ذریعے نوجوان نسلِ جدید کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح کے مطابق تیار نہ کر سکے تو عوام الناس

میں تو بے شک ہم بہت کچھ تبلیغ اور وعظ و نصیحت کر سکیں گے، مگر دلیل و برہان کی علمی سطح پر اُن ذہین و فطین افراد کو جو درحقیقت کسی قوم کا مکھن (cream of Nation) اور معاشرے کے اندر ریڑھ کی ہڈی (Back-bone) کی حیثیت رکھتے ہیں، ہم قرآن کی طرف ہرگز مائل نہیں کر سکیں گے — اور وقتِ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک اٹل حقیقت ہے جس کی تکذیب ممکن نہیں کہ اگر پورے معاشرے یا بحیثیتِ مجموعی پوری دنیا کو ایک انسانی وجود یا وحدت سمجھا جائے تو ذہین اقلیت (Intellectual Minority) اس وجود کے لیے بمنزلۂ دماغ (Brain) ہے جو پورے جسم کے مختلف نظاموں کو کنٹرول کر رہا ہے — چنانچہ جب بھی اور جہاں بھی زندگی کے اجتماعی نظام کی عمارت استوار ہوئی ہے ایسے ذہین و فطین لوگوں کی صلاحیتوں نے اس کے لیے اینٹوں کا کام دیا ہے۔ آج جبکہ پوری دنیا میں ہدایت کی بجائے ضلالت اور روحانیت کی بجائے مادیت کا بت ڈنکے کی چوٹ پوجا جا رہا ہے اور نوعِ انسانی کی بدقسمت کشتی بے خدائیت کے ایک عمیق و اتھاہ بھنور میں گھر کر ہچکولے کھا رہی ہے اور چیختی، چلاتی اور کراہتی ہوئی انسانیت کی دمادم "اب ڈوبی تب ڈوبی" کی دردانگیز اور جگر گداز صدائیں پوری کائنات کو افسردہ کر رہی ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ ذہین و فطین طبقہ (Intellectual Class) یا وجودِ معاشرہ کا دماغ (Brain) اللہ تعالیٰ کے حقیقی تصور کو چھوڑ کر اس کے خلاف بغاوت پر اُتر آیا ہے اور یہی وہ شدید درد و کرب ہے جس کے طفیل باقی پورے کا پورا جسم (معاشرہ) ایک طویل چیخ و پکار کے بعد اب موت و حیات کی کشمکش میں اپنی زندگی کی آخری سسکیاں لے کر لوم توڑ رہا ہے۔

پس ایک اور زبردست علمی تحریک کی ضرورت نہ صرف میرے دلِ ناصبور کی پکار ہے، بلکہ مجھے یقین ہے کہ یہ ہر اُس انسان کی آرزو اور تمنا بھی ہوگی جو علم بے خدا کے خنجر سے زخم خوردہ، اس کی ہلاکت و بربادی پر رنجیدہ اور انسانیت کی چیخ و پکار پر آبدیدہ ہو — آج عوام الناس سے کہیں بڑھ کر اعلیٰ فلسفیانہ

سطح پر اُس ذہین و فطین طبقے کو دعوتِ ایمان و یقین کی ضرورت ہے جن کے ہاتھوں میں عوام الناس کی زندگی کی باگ ڈور ہے اور جنہیں دعوت و تبلیغ ایک زبردست علمی تحریک کے بغیر ممکن نہیں۔

چنانچہ قرآن مجید فرقانِ حمید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے مبعوث شدہ ہر نبی یا رسول نے سب سے پہلے اپنے وقت کی ذہین اقلیت (Int-elligentsia of The Age) کو مخاطب کیا۔ اور آج بھی اگر ہم ایک ایسی عظیم الشان علمی اور انقلابی تحریک برپا کر کے ایسے سربرآوردہ لوگوں تک قرآن کی دعوت پہنچا سکے تو اس سے نہ صرف یہ کہ "پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے" کے مصداق موجودہ باطل اور طاغوتی نظامِ اجتماعی کی چولیں ہل جائیں گی، بلکہ عوام کی ایک بڑی اکثریت کے لیے بھی دعوتِ حق قبول کرنے کا راستہ صاف ہو جائے گا۔ اس تصویر کو ذہن میں رکھ کر اگر قرآن مجید کے اندر اُن مقامات اور آیات کا مطالعہ کیا جائے جہاں انبیاء کرام کی زبانی دعوتِ توحید کا ذکر ہے تو متصلاً بعد یہ الفاظ ملیں گے کہ: "قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ ... الخ" یعنی "قوم کے سرداروں (ذہین و فطین طبقے) نے جواب میں کہا" — اس امر کی تصدیق کے لیے قرآن مجید کی محوّلہ ذیل آیات اور مقامات کو دیکھا جا سکتا ہے:

۱۔ سورۃ الاعراف: آیات ۵۸، ۵۹، ۶۶، ۷۵، ۷۶، ۸۸، ۹۰۔

۲۔ سورۃ ہود: آیات ۲۵، ۲۶۔

۳۔ سورۃ المؤمنون: آیات ۲۳، ۲۴، ۳۳، ۴۵، ۴۶۔

بقیہ: حرفِ اوّل

قارئین نوٹ کر لیں کہ 'حکمتِ قرآن' کا زیرِ نظر شمارہ دو اشاعتوں کا قائم مقام ہے۔ یعنی یہ مارچ اور اپریل ۹۲ء کا مشترک شمارہ ہے۔ بعض ناگزیر وجوہات کے باعث ہمیں یہ قدم اٹھانا پڑا ہے' تاہم اس کی کمی کی تلافی کے طور پر اس پرچے کے صفحات کی تعداد میں قابلِ ذکر اضافہ کر دیا گیا ہے' جو قارئین کے لئے یقیناً موجبِ اطمینان ہوگا۔

ڈاکٹر عصمت جاوید

(۴)

عشق اور استحکامِ خودی

(منظوم ترجمہ "اسرار خودی")

نور کا نقطہ بنا ہم میں خودی
خاک ہم، وہ ہے شرارِ زندگی

عشق کے باعث خودی پائندہ تر
زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر

عشق سے ہے اس کے جوہر میں حیات
اس کے دل میں ارتقائے ممکنات

عشق سے اس کی طبیعت میں ہے سوز
عشق ہی سے ہے خودی عالم فروز

عشق کو تیغ دسناں سے باک کیا!
آب و گِل سے وہ نہیں ہے پاک کیا!

عشق اگر ہے صلح، تو پیکار بھی
آبِ حیواں بھی ہے وہ تلوار بھی

عشق کی نظروں سے پتھر بھی ہو شق
عشقِ حق ہے آخرش سرتا پا حق

عشق کر، اپنے لیے محبوب مانگ
چشمِ نوحؑ و فطرتِ ایوبؑ مانگ

ایک ایسا مردِ کامل ڈھونڈ لے
کیمیا جو تیری مٹی کو کرے

ڈوب جاویں عشقِ طوفاں خیز میں
روم تھا جیسے غمِ تبریز میں

ہے ترا محبوب خود تجھ میں نہاں
آنکھ رکھتا ہو تو میں کردوں عیاں

اس کے عاشق خوب سے بھی خوب تر
خوشتر و زیباتر و محبوب تر

دل میں اس کے عشق سے تاب و تواں
خاک اس کے عشق سے رشکِ جناں

عشق ہی کا فیض تھا کہ خاکِ نجد
پل میں پہنچی عرش پر، آیا جو وجد

قلبِ مسلم میں مقامِ مصطفیٰؐ
آبرو ہم سب کی نامِ مصطفیٰؐ

خاک اُس کی طور کا رکھے بھرم
اس کا گھر کہلے گا بیت الحرم

ایک پل اس کا ازل سے تا ابد — کون ناپے اُس کی پہنائی کی حد
بوریے پر سوئے وہ عالی تبار — اُس کے پیروِ تاجِ کسریٰ لیں اتار
جو حرا میں خلوتیِ راز تھا — ہاں وہی انساں حکومت ساز تھا
اُس کی آنکھیں رات میں محرومِ خواب — تاکہ برپا ہو جہاں میں انقلاب
تیغ اس کی جنگ میں آہن گداز — اور آنکھیں اس کی نم وقتِ نماز
ہر دعا پر کہتی آمیں اُس کی تیغ — قاطع نسلِ سلاطیں اُس کی تیغ
اک نیا آئین دنیا کو دیا — طرزِ اقوامِ کہن کو رد کیا
دین سے کر کے درِ دنیا کو باز — کر دیے وا ہم پہ اس دنیا کے راز
اس کا خود تاریخ دیتی ہے ثبوت — کب دیا دھرتی نے پھر ایسا سپوت
ایک تھے اس کی نظر میں خاص و عام — ساتھ دسترخوان پر ہوتے غلام
دخترِ طے[1] جنگ میں ہو کر اسیر — آئی جب پیشِ شہِ گردوں سریر
شرم سے تھا اس کا پیکر آب آب — پاؤں میں زنجیر اور رخ بے حجاب
جب نبیؐ نے دیکھی یہ بے پردگی — اپنی چادر اس کے سر پر ڈال دی
آج اُس خاتون سے بے پردہ تر — ہم کھڑے ہیں پیشِ اقوامِ دگر
کیوں نہ ڈالے اپنی چادر ہم پہ آج — رکھنے والا ہے وہی محشر میں لاج
وجہِ رحمت اس کا لطف و قہر تھا — دوست دشمن سب کے حق میں مہر تھا
[2] اس گھڑی جب موقعِ تادیب تھا — اس کے لب پر قولِ لاتثریب تھا

---

۱ قبیلہ طے کے سردار کی بیٹی۔

۲ فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلعم نے "لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ" (آج تم سے کوئی باز پرس نہیں) کہہ کر اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا تھا۔ یہی الفاظ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو معاف کرتے وقت استعمال کیے تھے (دیکھیے سورۂ یوسف آیت ۹۲)

دین میں لے کر وطن سے ہم پناہ
ایک ہیں، جیسے دو آنکھیں اک نگاہ

ہم حجازی بھی ہیں، ایرانی بھی ہیں
ہم میں ہندی اور خراسانی بھی ہیں

مستِ چشمِ ساقیِ بطحا ہیں ہم
متصل مثلِ مئے و مینا ہیں ہم

امتیازات نسب سے پاک ہیں
کیونکہ ہم آتش زنِ خاشاک ہیں

ایک بو، والے گلِ صد رنگ ہم
ایک ہیں خوشیاں ہماری ایک غم

ہم کہ اس کے دل میں تھے سرِ نہاں
ایک نعرے میں ہوئے سب پر عیاں

اس کا شورِ عشق میری نے میں ہے
شورش فریاد میری لے میں ہے

ذکر اس کا کیوں نہ پھیلے مثلِ مشک
ہجر[1] میں جس کے ہو گریاں چوبِ خشک

قلب ہر مسلم میں تابش اس سے ہے
طور پر عرفاں کی بارش اس سے ہے

آتشِ فرقت وہ اس کی، الاماں
کتنا تڑپاتا ہے وہ آرامِ جاں

میں گلستاں، وہ مرا ابرِ بہار
میں لبِ دریا، وہ دریا در کنار

منتیں کیں میں نے کتنی یار کی
تب ملی دولت مجھے دیدار کی

حسنِ یثرب پر ہے اک عالم نثار
وہ مرے محبوب کا ٹھہرا دیار

گرچہ فنِ شعر میں نامی ہوں میں
گشتۂ خوش گوئیِ جامی ہوں میں

شان میں جو اس کی جامی نے کہا
پیش کرتا ہوں، وہ شعرِ بے بہا

"نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست"[2]

---

[1] ستون حنانہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس لکڑی کے ستون سے آنحضرتؐ ٹیک لگا کر خطبہ فرمایا کرتے تھے۔ جب منبر تیار ہوا اور آپؐ خطبہ دینے کے لیے منبر پر تشریف فرما ہوئے تو صحابہ نے اس ستون سے چیخ کر رونے کی آواز سنی اور یوں لگا جیسے یہ ستون حضورؐ کی جدائی میں رو رہا تھا۔ اسی سبب اس کا نام ستون حنانہ (نوحہ کناں ستون) پڑا۔

[2] ترجمہ "آپؐ صحیفۂ کائنات کا دیباچہ ہیں ساری دنیا آپؐ کی غلام اور آپؐ ان کے آقا ہیں"۔

اسمِ اعظم سے نہیں کم اسمِ عشق — اتباعِ یار بھی از قسمِ عشق
لہ کاملِ بسطامؒ بھی کیا مرد تھا — اتباعِ یار میں جو فرد تھا
لہ کتنا سنت کا تھا اس کو احترام — کر لیا تھا خود پہ خربوزہ حرام
ہے اگر عاشق تو کر تقلیدِ یار — تاکہ اک دن بن سکے یزداں شکار
ہو مکیں دل کے حرا میں لمحہ بھر — ترکِ خود کر، سوئے حق کر جا سفر
حق سے مل کر لوٹ آ، خود میں سما — کر دے اصنامِ ہوس کا خاتمہ
لے چلے گا پھر تجھے سلطانِ عشق — جا کے دم لے گا سرِ فارانِ عشق

پھر بیاں ہونے لگیں گے تیرے گن
سلہ قولِ ربانی ہے "اِنِّی جَاعِلٌ"

**

لہ، لہ حضرت بایزید کی طرف اشارہ ہے جو شہر بسطام کے رہنے والے تھے اسی لیے بایزید بسطامی کے نام سے مشہور رہیں اور اقبال نے یہاں انہیں "کاملِ بسطام" کہا ہے۔ بایزید بسطامیؒ بڑے پایہ کے صوفی بزرگ تھے۔ انہیں آنحضرتؐ سے اس درجہ عشق تھا کہ ان کا ہر قول و فعل، آداب نشست و برخاست سنت کی مطابقت میں ہوتا۔ انہوں نے عمر بھر خربوزہ محض اس لیے نہیں کھایا کہ وہ یقین کے ساتھ نہیں جانتے تھے کہ حضورؐ یہ پھل کس طرح کھاتے تھے۔

سلہ اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ..... (میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں...) کی طرف اشارہ ہے۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

صدرِ مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن اور امیر تنظیمِ اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی علمی و فکری اور دعوتی و تحریکی کاوشوں کا نچوڑ

۲۸۰ صفحات پر مشتمل ایک اہم علمی دستاویز جس میں عملی خطوط کی نشاندہی بھی موجود ہے

دعوت رجوع اِلیَ القرآن کا منظر و پس منظر

چھپ کر آگئی ہے ــــ ضرور مطالعہ کیجئے ــــ دوسروں تک پہنچایئے

■ سفید کاغذ ■ عمدہ کتابت ■ دیدہ زیب طباعت ■ قیمت مجلد -/۶۵ روپے ■ غیر مجلد -/۵۰ روپے

MARCH, APRIL, 1992 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 11
NO.3-4

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ